رجسٹرڈ نمبر اے ۲۰ لائسنس نمبر 2397/57 ٹیلیفون نمبر 6135

ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ

حالی نمبر

حصۂ اول

فروری سنہ ۱۹۵۹ء

مرتبین

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ایم، اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ
سید احتشام حسین رضوی
شجاعت علی سندیلوی

قیمت حالی نمبر پانچ روپے

چندہ سالانہ دو روپے فی پرچہ چار آنے

ترتیب

1338

حالی نثر نگار

سید انصار حسین پرنٹر و پبلشر نے سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو
نعمت اللہ روڈ سے شائع کیا۔

حالی اور اُن کے تصورات　　　　دوسرے حصے کے متوقع مضامین

۱۔ حالی ایک مطالعہ	شمس عظیم آبادی
۲۔ حالی مصلح قوم	شکیلہ عالم
۳۔ بچوں کے حالی	افسر میرٹھی
۴۔ حالی اور مسئلہ زبان	ڈاکٹر اختر اورینوی
۵۔ حالی اور طنز	غلام احمد فرقت
۶۔ حالی کا نظریۂ تعلیم	خواجہ مقبول احمد
۷۔ مقدمہ بحیثیت مقدمہ دیوان	سید احتشام حسین
۸۔ مقام حالی	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
۹۔ حالی کی اہمیت	سید شبیہ الحسن
۱۰۔ حالی اور ان کے معاصرین	مہدی رضوی ۔ شجاعت علی سندیلوی

قند مکرر

۱۔ اردو کا واعظ شاعر	مولانا عبدالماجد دریابادی
۲۔ حالی حب وطن	ڈاکٹر ذاکر حسین
۳۔ حالی	آل احمد سرور
۴۔ مکاتیب حالی	ڈاکٹر عبدالحق
۵۔ مسدس حالی	ڈاکٹر عابد حسین
۶۔ مسدس کی مصلحانہ شان	خواجہ غلام السیدین
۷۔ حالی	مجنوں گورکھپوری
۸۔ مسدس حالی	سلیمان ندوی
۹۔ حالی کی سوانح نگاری	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
۱۰۔ حالی کا سیاسی شعور	احتشام حسین

اپنی باتیں

ادارہ

اگر کوئی رسالہ خواجہ الطاف حسین حالی کی یاد میں ایک خاص نمبر شائع کرے تو اس کے لیے نہ کسی قسم کے اعتذار کی ضرورت ہے نہ تفصیلی اظہار خیال کی، کیونکہ جہاں تک حالی کی شخصیت، ادبی مقام اور کارناموں کی اہمیت کا تعلق ہے وہ صرف رسائل کے خاص نمبروں کے مستحق نہیں ہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف نقادِ نظر سے لکھی ہوئی متعدد مبسوط تصانیف کی مدد سے ان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ حالی کے انتقال کے بعد رسالہ زمانہ (کانپور) نے ایک مخصوص نمبر اُن کے لیے وقف کیا، اردو کراچی نے چالیس سال بعد حالی نمبر شایع کیا اور دوسرے رسائل نے وقتاً فوقتاً ایک آدھ مضامین شامل کر لینے کے علاوہ ادھر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ کبھی کبھی ادبی انجمنوں نے یوم حالی منایا، ریڈیو اسٹیشنوں سے کچھ مخصوص پروگرام پیش کئے گئے اور ۱۹۳۶ء میں حالی کے یوم پیدائش کی یاد میں ایک صد سالہ جشن ان کے وطن پانی پت میں بڑے پیمانے پر منایا گیا۔ گزشتہ دسمبر میں انجمن نوجوان مصنفین بمبئی نے مولانا حالی پر چند لکچروں کے لیے پروفیسر احتشام حسین کو مدعو کیا اس طرح وقتاً فوقتاً ان کی یاد تازہ کی جاتی رہی ہے لیکن دورِ جدید کے ایک

ممتاز معمار، اُردو ادب کے ایک کارواں سالار، دورِ تغیر کے ایک محتاط رہنما کو جس طرح یاد کرنا چاہیے اُس کے لیے یہ سب کچھ ناکافی ہے۔ اس وقت تک مولانا حالی پر جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں یادگارِ حالی، تذکرۂ حالی، حالی کا ذہنی ارتقا، چند انتخابات کے دیباچے یا مقدمے اور چند مضامین کے مختصر مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے ہماری بے حسی کے سوا اور کسی بات کا اظہار نہیں ہوتا ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے بعد سے اس وقت تک متعدد حضرات نے مختلف یونیورسٹیوں سے حالی پر تحقیقی مقالے لکھ کر سندیں حاصل کی ہیں، اور بہت سے لوگ اس وقت بھی کاموں میں لگے ہوئے ہیں لیکن حالی نے عہدِ حاضر کے ادب کو جس طرح متاثر کیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ابھی کئی تصانیف کی گنجائش ہے۔

انھیں باتوں کو مدِ نظر رکھ کر ہم نے یہ خیال کیا کہ فروغِ اردو کی طرف سے بھی خواجہ الطاف حسین حالی کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کریں۔ یہ حالی نمبر اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ ہم نے کافی غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ حالی کی زندگی، ذہن و فکر و فن کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں اُن سب پر مقتدر اہلِ قلم سے مضامین لکھنے کی درخواست کی جائے تاکہ کوئی ضروری بات رہ نہ جائے مہینوں خط و کتابت میں صرف ہوئے اور ہمیں بے حد مسرت ہے کہ اکثر حضرات نے ہماری درخواست کو دُرخورِ اعتنا سمجھا اور اپنی مصروفیات کے باوجود مقالے قلم بند کیے۔ پھر بھی بعض پہلو تشنہ رہ گئے اور ہم جس طرح اس نمبر کو مرتب کرنا چاہتے تھے اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے علاوہ

ہیں یہ بھی ضروری معلوم ہوا کہ نئے لکھنے والوں کے اچھے مضامین اس نمبر میں شامل کئے جائیں تاکہ اُن کی ہمت افزائی ہو اور وہ اس بوجھ کے اُٹھانے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کریں جسے ہمارے بزرگ ادیب اس وقت تک اُٹھاتے آئے ہیں۔

جب ہم نے سارے مواد کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ ان سب کو ایک ہی جلد میں شامل نہیں کیا جا سکتا، اس سے ہر طرح کی دشواریاں پیدا ہوں گی اس لیے حالی نمبر کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں نمبر یکے بعد دیگرے تھوڑے ہی دنوں کے اندر شایع ہوں گے اور اگر کچھ اچھے مضامین اور دستیاب ہو گئے (جن کی ہمیں توقع ہے) تو ضمیمہ کے طور پر اس کا تیسرا حصہ بھی شایع کر دیا جائیگا۔ ان نمبروں میں جو مضمون شامل کئے گئے ہیں ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ان میں سے اکثر ان ذمہ دار ادیبوں کے قلم سے نکلے ہیں جن سے ہماری ادبی روایت آگے بڑھ رہی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن میں زیادہ گہرائی، پختگی یا ادبیت نہیں ہے لیکن ان میں کوئی ایسی خصوصیت ضرور ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ آپ دونوں حصّوں کی فہرست پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان مضامین کے یکجا کرنے میں ہم نے کیا کاوشیں کی ہیں اور یہ کس حد تک حالی نمبر کو جہاں تک ہو سکے مکمل شکل میں پیش کرنے کے لیے ہم نے بعض اچھے شایع شدہ مضامین بھی دوسرے حصّے میں شامل کر لیے ہیں اور انھیں "قندِ مکرر" کے عنوان سے ایک الگ باب میں یکجا کر دیا ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ حالی پر کام کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ مواد ایک ہی جگہ پر

دستیاب ہو جائے۔ ہم کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ نمبر حالی پر کسی مبسوط تصنیف کا بدل نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جب بھی وہ متوقع کتاب لکھی جائے گی فروغ اردو کے حالی نمبر سے استفادہ اس کیلئے بھی ضروری ہو جائے گا۔

یوں تو ہمیں اس نمبر کی تیاری میں بہت سے حضرات سے مدد ملی ہے لیکن ہم خاص طور سے ان مقتدر ادیبوں کے ممنون اور شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنے تعاون سے اس نمبر کو گراں قدر اور وقیع بنا دیا ہماری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکتی اگر محمد حسین شمس علوی صاحب منیجر ادارۂ فروغ اردو ہمارے ہر مشورے پر لبیک نہ کہتے اور سید انصار حسین صاحب منیجر سرفراز پریس لکھنؤ اور شمیم احمد صاحب منیجر مکتبۂ فروغ اردو اسے کم وقت میں اسے انجام دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتے۔ ہم ان حضرات کے بھی شکر گزار ہیں کیونکہ ان کی انتھک کوششوں کے بغیر یہ ضخیم نمبر شائع کرنا آسان نہ ہوتا۔

مرتبین حالی نمبر

ماہنامہ فروغ اردو کا اجرائی سنہ ۵۴ء میں ہوا تھا، اس وقت سے اب تک یہ ماہنامہ وقت کی پابندی کے ساتھ برابر شائع ہوتا ہے۔ اپنی مختصر پنج سالہ زندگی میں اس نے کئی مخصوص نمبر (ادبی معرکہ نمبر، جنگ آزادی نمبر، اور افسانہ نمبر) نکالے، درحقیقت یہ ساری کامیابی رسالہ کے مدیر اعزازی۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور اعزازی معاونین سید امیر حسن نورانی و شجاعت علی سندیلوی اور حکیم عبدالقوی دریابادی صاحبان کی مخلصانہ و رضاکارانہ کوششوں کا ثمرہ ہے۔ میں ان تمام حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور متوقع ہوں کہ وہ آئندہ بھی فروغ اردو کے لیے اپنے مفید مشوروں سے سرفراز فرماتے رہیں گے۔

[illegible]

حالی کی کہانی خود اُنکی زبانی

"اپنی یہ مختصر سوانح عمری مولانا نے ۱۹۰۱ء میں نواب عماد الملک بہادر کی فرمائش پر لکھ کر حیدر آباد بھیجی تھی جن سے اُن کے کسی دوست نے لندن سے مولانا کے حالات منگائے تھے۔ مولانا نے ان حالات کی ایک نقل اپنے قلم سے اپنے مستعملہ "دیوان حالی" کے ابتدائی اوراق پر لکھی تھی وہیں سے یہ نقل لے کر یہاں درج کی جاتی ہے۔"

ولادت میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی واقع ہوئی۔

سلسلۂ نسب اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس کو راقم کو تعلق ہے چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن[1] تخت دہلی پر متمکن تھا

[1] غیاث الدین بلبن - خاندان کا نواں بادشاہ اور بڑا منتظم، لائق، منصف، متقی اور پرہیزگار

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری[۱] معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی[۲] نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابوایوب انصاری[۳] تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ ابجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارو کرمان و ... تجم کا فرمان روا تھا پہنچتا ہے۔

بقیہ فٹ نوٹ سابق انسان تھا شمس الدین التمش نے بطور ایک غلام کے خریدا تھا۔ پھر اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی تقدیر نے ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ نہایت کامیابی اور امن و امان کے ساتھ ۲۰ سال ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد ۸۰ برس کی عمر میں ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) میں انتقال کیا۔

۱؎ خواجہ عبداللہ انصاری، ہرات کے نہایت مقدس اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ یہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور بڑے صوفی منش انسان تھے۔ آل سلجوق کے زمانے میں ۹ شعبان ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ء) کو پیدا ہوئے اور پچاسی برس کی عمر میں ۴۸۱ھ (۱۰۸۸ء) میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی

۲؎ خواجہ ملک علی۔ یہی بزرگ تھے جو انصاریوں میں سب سے پہلے پانی پت میں وارد ہوئے۔ ۸۱۰ھ ان کا سال وفات ہے

۳؎ حضرت ابوایوب انصاری آں حضرت کے جلیل القدر صحابی ہیں ۴۷ھ (۶۶۸ء) میں قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے انتقال فرمایا۔ جہاں آپ جہاد کے لئے تشریف لے گئے تھے آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہ عوام ہے۔

آباو اجداد کا ہندستان آنا چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد[1] علما و شعرا اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا اس لئے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندستان پر آمادہ کیا تھا چنانچہ سلطان غیاث الدین چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے انکو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیصِ نرخ بازار اور تولیتِ مزاراتِ ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان کے متعلق کر دی۔

پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں کی اولاد سے منسوب ہے۔

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں "سادات شہداپورہ" کے نام سے مشہور ہیں بیٹی تھیں۔

---

[1] محمد سلطان غیاث الدین کا بیٹا اور ملتان اور سندھ کا صوبہ دار تھا۔ نہایت علم دوست اور فاضل شخص تھا اس کا دربار ہمیشہ علما و فضلا سے بھرا رہتا تھا۔ شیخ سعدی کو ایران سے طلب کیا مگر وہ نہ آسکے البتہ انھوں نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستاں بوستاں کا ایک نسخہ تحفہ بھیجا۔ یہ شہزادہ مغلوں سے ایک لڑائی کے دوران میں ۶۸۳ھ میں مارا گیا۔

خاندان کا ذریعہ معاش اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں بہت سے لوگوں نے اوّل سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہان اودھ کی سرکار میں نہایت درجے کا امتیاز حاصل کیا تھا مگر زیادہ تر یہ لوگ اُسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے جو سلاطینِ اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً اُن کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آبا و اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سر رشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

والد کا انتقال اور بھائی کی سرپرستی میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد نے (۴۰ برس کی عمر میں) سنِ کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔

تعلیم۔ انھوں نے اوّل مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے تھے اور میرے داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اُن کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند

لے کر آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی۔

شادی چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

تعلیم کا شوق دہلی لے گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔

انگریزی نہ پڑھنے کے وجوہات ۔اگرچہ اُس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سُننے میں نہیں آتا تھا۔ اور اگر اُس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اُس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما جہلے[1] کہتے تھے دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض

---

[1] یعنی جہالت کی جگہ

جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا ڈیڑھ برس تک دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔ اور نہ ان لوگوں سے (اس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

دلی سے جبری واپسی۔ میں نے دلی میں شرح سلم، ملا حسن اور ہندی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آ کر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملازمت ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔

۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا ۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزرے

دوبارہ تعلیم کا آغاز اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب و نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے

کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور چھکر علم ادب کی کتابیں شروع اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

مرزا غالب کی خدمت میں باریابی جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوتا تھا مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"، مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلق۔ غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم[۱] رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد

[۱] شیفتہ بہت متین، سنجیدہ اور مہذب بزرگ تھے۔ ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے

ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومنؔ[2] خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالبؔ سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پُرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا، جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷ عربی و فارسی کے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے حکیم مومنؔ خاں مومنؔ کے فنِ شعر میں شاگرد تھے۔ ان کا تذکرہ شعرائے اردو "گلشنِ بیخار" بہت مشہور ہے ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

[2] حکیم مومن خاں مومنؔ کشمیری الاصل اور خاندانی طبیب تھے۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی پچھلے دور کے نہایت مشہور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں اتفاقیہ کوٹھے سے گر کر مر گئے۔ صرف ۳۵ سال کی عمر پائی۔

حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا، اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیہ کا ذکر ہو رہا تھا انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرعہ پڑھا۔ ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس[1] نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بکڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی اُردو عبارت درست کرنے کو مجھ کو ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی

[1] انیس۔ میر حسن دہلوی کے پوتے۔ زبردست شاعر اور اردو میں مرثیہ گوئی کی ایک خاص طرز کے موجد ہیں۔ صفائی کلام۔ خوبیٔ بیان۔ لطف محاورہ۔ اور سوز و گداز ان کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ کو ۷۱ سال کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔

لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کا انعقاد: لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین[1] آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔

میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی: اس کے بعد لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر

مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف: میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان

---

[1] شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ دہلی کے رہنے والے، مولوی باقر علی کے بیٹے اور محمد ابراہیم ذوق کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ بہت سی ادبی اور تاریخی کتابوں کے مصنف اور زبردست انشاپرداز تھے۔ افسوس ہے کہ آخر عمر میں مجنون ہوگئے تھے اور اسی حالت میں ۲۰ سال مبتلا رہنے کے بعد ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔

کی جائے تو مفید ہو گی چنانچہ میں نے اوّل مسدس مد و جزر اسلام اور اسکے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

تریاق مسموم کا لکھنا | نظم کے سوا میں نے نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہموطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا۔ لکھی تھی جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔

علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ | اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اوّل تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔

مجالس النساء کی تصنیف | لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کیلئے قصے کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک[۱] کے ہاتھ سے

---

[۱] لارڈ نارتھ بروک ہندوستان کا وائسرائے تھا جس نے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک یہاں حکومت کی اس کے عہد میں سب سے پہلے پرنس آف ویلز ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کی سیاحت کے لئے آئے

چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

حیات سعدی کا لکھنا پھر دلّی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے اور جس کے دس بارہ اڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری اور دیوان کا شائع کرنا پھر شاعری پر ایک بسوط (مضمون) لکھ کر بطور مقدمے کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔

یادگار غالب کی تصنیف اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے، یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی۔

حیات جاوید اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیات جاوید جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔

صرف و نحو کے متعلق چند کتابیں ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں[1]۔

مختلف مضامین اس کے علاوہ بیس تیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق علی گڈھ گزٹ اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

---

[1] فارسی گریمر میں مولانا نے ایک کتاب "اصول فارسی" کے نام سے لکھی تھی مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

فارسی نظم و نثر نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز[۱] شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔

سب سے آخیر فارسی و اردو نظم میری سب سے آخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ میں لکھا تھا[۲] اور اردو میں سب سے آخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے[۳]

حیدرآباد سے وظیفہ کا تقرر اور ملازمت سے علیحدگی ۱۳۰۵ھ میں جب کہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر جو مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے۔ اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغۂ

---

[۱] عربی و فارسی نظم و نثر کا مجموعہ مولانا کی وفات سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکا تھا۔

[۲] سرسید کا یہ فارسی مرثیہ مولانا کی شائع کردہ کلیات نظم میں موجود ہے۔

[۳] یہ دل گداز اور پر درد نظم "کلیات نظم حالی اُردو" میں موجود ہے۔

امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپے ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڈھ حیدرآباد گیا تھا اس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کرکے سو روپیہ سکہ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

تصانیف حآلی

مولانا حآلی نے نثر سے پہلے نظم لکھی، لیکن تصنیف و تالیف کا کام نثر سے شروع کیا اس لیے ان کی نثر و نظم کی کتابیں اسی ترتیب سے پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ عربی رسالہ:۔ یہ رسالہ غالباً ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا تھا ضایع ہو گیا

۲۔ مولود شریف:۔ یہ میلاد شریف غالباً ۱۸۶۴ء کے بعد لکھا گیا تھا بعد میں شایع ہوا

۳۔ تریاق مسموم:۔ پادری عماد الدین کی کتاب ہدایت المسلمین کے جواب میں غالباً ۱۸۶۸ء میں لکھی۔

۴۔ طبقات الارض:۔ یہ کتاب مولانا نے ۱۸۷۲ء میں ترجمہ کی۔

۵۔ اصول فارسی:۔ مولانا نے یہ کتاب فارسی قواعد پر محکمہ تعلیم پنجاب کے لئے ۱۸۷۲ء میں لکھی تھی۔

۶۔ تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے:۔ یہ کتاب بھی پادری عماد الدین کی

کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں جو ۱۸۷۲ء میں لکھی گئی اور شائع ہوئی

۷۔ شواہد الالہام:۔ یہ رسالہ ۱۸۷۳ء میں لکھا گیا۔

۸۔ تذکرہ رحمانیہ سوانح عبدالرحمٰن۔ مولانا نے اپنے استاد مولانا عبدالرحمٰن کے سوانح حالات لکھے تھے

۹۔ مجالس النسا۔ عورتوں کی اصلاح کیلئے یہ کتاب مولانا نے دو حصوں میں ۱۸۷۴ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب پر انعام ملا تھا۔

۱۰۔ سوانحعمری حکیم ناصر خسرو۔ مولانا نے حکیم موصوف کے حالات نہایت تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھکر سفرنامہ میں اضافہ کئے اور ۱۸۷۲ء میں دہلی سے شائع کیا۔

۱۱۔ حیات سعدی۔ شیخ سعدی کی مکمل و مفصل اور مبسوط سوانحعمری غالباً ۱۸۸۴ء میں لکھی۔

۱۲۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ یہ مقدمہ دیوان حالی کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۸۹۳ء میں شایع ہوا۔

۱۳۔ یادگار غالب۔ مرزا غالب کے مکمل حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ، ۱۸۹۷ء میں لکھی۔

۱۴۔ حیات جاوید۔ سر سید احمد خاں کے حالات ۱۹۰۱ء میں لکھی۔

۱۵۔ مقالات حالی۔ مولانا نے مختلف عنوانات کے تحت جو مضامین لکھے وہ دو حصوں میں انجمن ترقی اردو سے شایع ہوئے

۱۶۔ مضامین حالی۔ مولانا کے مضامین کا مجموعہ ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا۔

۱۷۔ مکتوبات حالی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں حالی کے خطوط کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔

۱۸۔ مکاتیب حالی۔ مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

کتابوں کے خاکے جو مکمل نہ ہو سکے

۱۔ رسالہ تذکیر و تانیث ۲۔ روئیداد جشن چہل سالہ حضور نظام

۳۔ آنحضرت صلعم کی ایک مکمل سوانحعمری ۴۔ مرزا داغ کے کلام کا انتخاب

۵۔ اصلاح معاشرت پر ناولیں ۶۔ عربی و فارسی کے مضامین

۷۔ الشامہ۔ الفاظ کی عجیب و غریب لغت لکھنا شروع کی تھی

تصانیف نظم

۱۔ خمسہ نعتیہ۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں حاجی جان محمد قدسی کی مشہور نعتیہ غزل مرحبا سید مکی مدنی العربی پر ایک تضمین لکھی

۲۔ قصیدہ نعتیہ سنہ ۱۸۶۴ تا سنہ ۱۸۶۵ء میں یہ نعتیہ قصیدہ لکھا۔

۳۔ مرثیہ غالب سنہ ۱۸۶۹ء۔ اپنے استاد مرزا غالب کی وفات پر لکھا۔

۴۔ جو مردی کا کام۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں انگریزی حکایت کا آزاد ترجمہ کیا

۵۔ لاہور کے مشاعروں کی نظمیں۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں لکھیں۔

۶۔ ترکیب بند زمزمہ قیصری۔ سنہ ۱۸۷۸ء میں لکھی

۷۔ مسدس حالی۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں لکھی

۸۔ ترکیب بند مدرسۃ العلوم مسلمانان سنہ ۱۸۸۰ء

۹۔ مثنوی تعصب و انصاف ۔ ۱۸۸۲ء

۱۰۔ مثنوی کلمۃ الحق ۱۸۸۳ء

۱۱۔ مناظرہ واعظ و شاعر ۔ ۱۸۸۳ء

۱۲۔ مناجات بیوہ ۔ ۱۸۸۴ء

۱۳۔ مسدس ننگ خدمت ۔ ۱۸۸۷ء

۱۴۔ پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ ۔ ۱۸۸۷ء

۱۵۔ مثنوی حقوق اولاد ۱۸۸۸ء

۱۶۔ شکوۂ ہند ۔ ۱۸۸۸ء

۱۷۔ قصیدہ غیاثیہ یا عرض حال ۔ ۱۸۸۸ء

۱۸۔ مسلمانوں کی تعلیم ۔ ۱۸۸۹ء

۱۹۔ مجموعہ نظم حالی ۔ ۱۸۹۰ء اس میں ۵ نظمیں ہیں

۲۰۔ ترکیب بند قوم کا متوسط طبقہ ۔ ۱۸۹۱ء

۲۱۔ مرثیہ حکیم محمود خاں ۔ ۱۸۹۲ء

۲۲۔ ترکیب بند برائے ایجوکیشنل کانفرنس دہلی ۔ ۱۸۹۲ء

۲۳۔ دیوان حالی ۔ ۱۸۹۳ء

۲۴۔ سرسید کا مرثیہ ۔ (فارسی) ۱۸۹۸ء

۲۵۔ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ ۔ ۱۹۰۱ء

۲۶۔ گدایان قوم ۔ ۱۹۰۱ء

۲۷۔ صدائے گدایان قوم ۔ ۱۹۰۱ء

۲۸۔ شکریہ والی رام پور ۔ سنہ ۱۹۰۱ء

۲۹۔ تحفۃ الاخوان ۔ سنہ ۱۹۰۲ء

۳۰۔ فلسفہ ترقی ۔ سنہ ۱۹۰۳ء

۳۱۔ جیب کی داد ۔ سنہ ۱۵۱۶ء

۳۲۔ مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت ۔ سنہ ۱۹۰۴ء

۳۳۔ ترکیب بند برائے انجمن حمایت الاسلام ۔ سنہ ۱۹۰۴ء

۳۴۔ محسن الملک کا مرثیہ ۔ سنہ ۱۹۰۷ء

۳۵۔ تہنیت نامہ ۔ سنہ ۱۹۱۱ء

۳۶۔ حکیم اجمل خاں کے خطاب پر قطعہ تہنیت سنہ ۱۹۰۸ء

۳۷۔ کمسن بچی کے لئے نظم ۔ سنہ ۱۹۰۷ء

۳۸۔ ترکی و بلقان کی جنگ پر ایک قطعہ سنہ ۱۹۱۲

۳۹۔ ترغیب امداد یتیمان ۔ سنہ ۱۹۰۵ء

۴۰۔ شکریہ حضور لفٹننٹ گورنر بہادر سنہ ۰۵ء

۴۱۔ شکریہ مولانا ظفر علی خاں سنہ ۱۹۱۳ء

۴۲۔ ہنگامہ کانپور پر رباعیاں سنہ ۱۹۱۳ء

مولوی اسمٰعیل پانی پتی نے حالی کے جملہ کلام کو جمع کر کے حسب ذیل مجموعوں میں شائع کیا

۱۔ جواہرات حالی ۔ سنہ ۱۹۲۲ء دیوان حالی مع ضمیمہ کا مکمل کلام

۲۔ کلیات نظم حالی ۔ سنہ ۱۹۳۴ء قطعات، غزلیات، رباعیات

۳۔ کلیات نظم حالی ۔ سنہ ۱۹۳۴ء اس میں ۱۲ ترکیب بند ہیں

۴۔ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی مشتمل نظم و نثر فارسی و عربی

ان کے علاوہ حالی کی سیرت میں یہ کتابیں جو متعدد مطابع میں شائع ہوئیں

۱۔ حیات حالی۔

۲۔ تصنیفات حالی۔

۳۔ تذکرے کے لئے دیکھیں

حالی کا عہد

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین

حالی اور اُن کا زمانہ

خواجہ الطاف حسین حالی اُن صالح بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے شعر و ادب کے ذریعہ دنیا کی اخلاقی طہارت کا کام سرانجام دیا۔ ان کی تنقید، شاعری مکاتیب اور سوانح نگاری ہر چیز سے ایک شریف، سادہ لوح، مخلص اور ہمدرد دل کا اظہار ہوتا ہے۔ اس درویش صفت انسان کی زندگی شورشوں اور ہنگاموں سے یکسر بیگانہ تھی۔ یوں سمجھئے کہ ایک بے کیف سا سلسلۂ حیات تھا جس میں نہ کسی قسم کی رنگینی تھی اور نہ شوریدہ سری، تنگدستی اور فکر معاش عمر بھر ستا نہ دبائے رہے لیکن قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ادبی شخصیتوں میں فروتنی اور بلندیٔ اخلاق کی ایسی مثال کہیں کہیں ملتی ہے۔

حالی نے غدر سے بیس سال پہلے پانی پت کے ایک معمولی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ بچپن ہی میں ماں اور باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا اس لئے تعلیم بھی باقاعدگی سے نہ مل سکی۔ زمانہ ایسی افراتفری کا تھا کہ ملک کی سیاست اور معاش دونوں منتشر تھے۔ اندر اور باہر ہر جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ لشکر

گھر والوں کو خبر نہ تھی۔ قوم مقصد سے بیگانہ تھی۔ تاجدار سیاسی بے بسی کا شکار تھے لیکن انھیں اپنے حال کے سرے نظر نہ آتے تھے۔ اس لیئے وہ اپنے حال پر قانع تھے۔ ایک نشہ تھا جس نے چہروں کو سُرخ کر دیا تھا لیکن جسم میں جان نہ تھی۔ تہذیب او معاشرت جو صدیوں کی کوشش اور کاوش کا نتیجہ تھے، رفتہ رفتہ اپنی جڑیں چھوڑ رہے تھے۔ عشق اور زندگی دونوں عمل سے بیگانہ ہو چلے تھے۔ جن ادیبوں کے دلی نعمت حسن پرستی اور عیش دوستی کے علاوہ زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ رکھتے ہوں۔ اُن کا ادب جذبات پرستی، توہم پرستی اور لذت کوشی کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ ایک فرضی عشق تھا جو سب کے ذہنوں پر سوار تھا۔ یہ نامساعد ملکی حالات تھے جن کے گہوارے میں حالی کی طبیعت کی پرداخت ہوئی۔

جوانی کس پر نہیں آتی؟ اُن پر بھی آتی ہے جن کا کوئی آسرا نہیں ہوتا۔ لیکن اُن کی آنکھیں خشک ہوتی ہیں اور دل میں جذبات کی طغیانی ہوتی ہے اُن کی چیخیں سسکیاں بن جاتی ہیں حالی کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ نوعمر حالی کی "خاطر الفت شعار" کے لئے دلی کا قیام جہاں کا "ذرہ ذرہ مہر فزا" تھا۔ ایک تازیانہ سے کم نہ تھا۔ جوانی میں جوانی کی تمام فطری امنگیں موجود ہوں اور شعر کہنے کی صلاحیت بھی ہو تو عشقیہ شاعری وجود میں آتی ہے۔ غربت کے حسین مشغلے جنھوں نے وطن تک کو بھلا دیا تھا شعر بن کر حالی کی زبان پر آگئے محبت نے شعر کی زبان اختیار کر لی۔ حالی چونکہ دور انحطاط کی پیداوار تھے اس لئے ایک مدت تک ماحول کے دھندلکے سے آگے نہ دیکھ سکے اور اپنے دوسرے

ہم عصروں کی طرح اُن کے لئے بھی ایک عرصہ تک شاعری عشقیہ جذبات ہی کی زبان بنی رہی اور غزل اُن کا ذریعۂ اظہار رہی لیکن کچھ طبیعت کی شائستگی اور کچھ غالب و شیفتہ کا فیض صحبت تھا جس نے اُنھیں غزل گوئی کی مروجہ بے راہ روی سے بچالیا۔

۱۸۵۷ء کی تباہ کاریاں آئیں اور گزر گئیں لیکن حالی کی طبیعت کا جذباتی اور داخلی رنگ نہ بدلا۔ یہانتک کہ ملک کے ایک گوشے سے سرسید نے صبح نو کی بشارت دی۔ پہلے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی پھر ورنیکلر یونیورسٹی کی تجویز مرتب کی یورپ جاکر سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کا جواب لکھا۔ صحیح اسباب غدر بتا کر مسلمانوں کی بغاوت کے الزام کو دور کیا ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس آکر "انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند" قائم کی اور ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد علی گڈھ میں ڈال دی۔ بالکل اسی زمانہ میں ہندوستان میں وطن پرستی کی تحریک شروع ہوئی جسے جاپان کے قومی عروج نے کافی متاثر کیا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک اور ملک کی سیاسی تحریک کے متوازی محمد حسین آزاد نے پنجاب میں ادبی اصلاح کا کام شروع کیا۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے اہتمام سے جدید مشاعروں کی طرح ڈالی جدید نظم گوئی کا آغاز کرایا۔ ملک کے قدرتی مناظر یا اصلاحی موضوعات پر نئے انداز کی نظمیں لکھنے کا راستہ دکھایا۔ جدید مضمون نگاری کے نمونے پیش کئے اور اس طرح ہمارے ادبی شعور کی تجدید کی۔ جب آزاد فرسودہ روایات کے بت توڑنے اور نئی اقدار قائم کرنے میں منہمک تھے تو حالی اُس وقت گورنمنٹ بکڈپو

پنجاب میں ملازم تھے۔ لاہور کے ان جدید مشاعروں میں انھوں نے بھی شرکت
کی اور برکھا رت، نشاط امید، مناظرۂ رحم و انصاف اور حب وطن وغیرہ
نظمیں لکھ کر آزاد کا ہاتھ بٹایا۔ اور ایسی صلاحیتوں کے ذریعہ جدید شاعری کے معماروں میں
شامل ہو گئے اس میں شک نہیں کہ حالی نے اپنے بعض معاصرین کے ساتھ
کام کر کے اُردو شاعری کی قدریں بدلیں لیکن اُن کی کوششیں اُس وقت تک
تعمیری صورت اختیار نہ کر سکیں جب تک انھیں سر سید کی صورت میں ایک
رہنما نہ مل گیا۔

سر سید کی تشکیل قوم اور تجدید ملت کی تحریکوں میں حالی کو ان کی اپنی امنگوں کا
سُراغ مل گیا۔ یا یوں سمجھئے کہ اُن کی کوششوں کو ایک نصب العین ہاتھ آگیا اسکے
بعد انھوں نے مُردہ قوم میں زندگی کی روح پھونکنے کے لئے وہی سب کچھ کیا جو سر سید
کا منشا تھا۔ ہماری تہذیب تمدن کے تار و پود مرتب کرنے اور سنوارنے میں
سر سید نے جو عملی کام کیا تھا حالی نے اُسی نوعیت کا کام شعر و ادب کے ذریعہ
انجام دیا۔ غدر کے حادثات حالی کا موضوع شعر نہ بن سکے تھے۔ لیکن تباہی کے
ازالہ اور تعمیر نو کی کاوش میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ کم و بیش چالیس سال کے
پختہ سن میں انھوں نے ملی شاعری شروع کی اور سر سید کے مشورے سے مسدس
مدوجزر اسلام، لکھ کر مسلمان کو چونکا دیا۔ اس نظم سے حالی کا وہ دور حیات شروع
ہوتا ہے جسے عشقِ ملت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں قومی دردمندی
اور قومی اصلاح کے علاوہ انھیں کوئی دھن نہ رہی تھی اب رفتہ رفتہ غم عشق اور
غم روزگار ملت کے غم میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ یہ مسدس ہمارے فرسودہ

نظام معاشرت کی مدلل تجویز ہے اسے سرسید کا "توشہ آخرت" کہا گیا ہے۔ لیکن یہ ہمارا صحیفۂ معاشرت بھی ہے اس میں ہماری قوم کے عروج وزوال کی تصویر بھی ہے اور ایک بشارت ازلی بھی۔ اس کا وہ تعمیری حصہ بڑے کام کا ہے جہاں مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار کے احیاء کا ذریعہ محنت، سادگی، عدل وانصاف باہمی محبت رواداری، وسعت نظر اور بلند خیالی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اس نظم سے ہم آج بھی ایک ایسا نظام اخلاق ترتیب دے سکتے ہیں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منور کر سکتا ہے اُردو شاعری میں معاشرتی اصلاح کے متعلق ایسی بھرپور نظم حالیؔ سے پہلے نہیں لکھی جا سکی تھی۔ خود حالیؔ نے اس نظم کو اُبالی کھچڑی سے تشبیہہ دی ہے لیکن اس میں فنی اور افادی پہلوؤں کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو شاعری کی معراج ہے۔

مسدس نے حالیؔ کو شہرت دوام دی اور سرسید کی کوششوں نے سرکار نظام سے ان کا وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اب فکر معاش سے مطمئن ہو کر انھوں نے اپنی زندگی علمی ادبی اور قومی خدمات کیلئے وقف کر دی۔ حالیؔ کی خدمت قوم کا یہ سلسلہ اُس وقت تک چلتا رہا جب کہ ضعف بصارت اور ضعف پیری نے انھیں بالکل ہی مجبور نہ کر دیا۔ آخر ۱۹۱۴ء میں آسمان ادب کا یہ درخشندہ ستارہ غروب ہو گیا۔

حالیؔ کی تصانیف بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن یہ خوبی ہے کہ جس صنف ادب پر بھی انھوں نے توجہ کی ہے اس میں اپنی نکتہ رسی سے اجتہاد کے پھول کھلا دیئے ہیں چنانچہ شاعری میں وہ بالکل اچھوتے انداز کے شاعر ہیں

تنقید میں وہ ترقی یافتہ نقاد ہیں اور اُردو سوانح نگاری میں اُنھیں مجتہد کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ اُن کا دیوان جو قدیم و جدید غزلیات اور معاشرتی اور اصلاحی نظموں کا مجموعہ ہے اُردو ادب میں ایک مخصوص انفرادیت رکھتا ہے غزلیں اس میں بھی ہیں لیکن نہ اُن میں کسی قسم کی تخیلی پیچیدگی ہے اور نہ دقت پسندی اُن کے عشق میں خودداری و وقار ہے اُن کے جذبات پر ضبط و اعتدال کا تسلط ہے وہ نہ محبوب کی بے جا خوشامد کرتے ہیں اور نہ اُس کے دامن کو حریصانہ کھینچتے ہیں۔ انھوں نے اپنی افتادِ عشق ایسے سنبھلے ہوئے انداز اور مانوس لہجے میں بیان کی ہے جس سے اُن کے محبوب اور اُن کی محبت دونوں کا وقار بڑھ گیا ہے سادگی، اصلیت، اور عقل و جذبات کا ایسا توازن اُن سے پہلے غزل کو نصیب نہ تھا۔ اُن کے دیوان میں جدید عنوانات پر جو نظمیں، قطعات اور رُباعیاں ہیں اُن میں بھی حالی کی انفرادیت نمایاں ہے یوں کہنے کو تو مناظرِ قدرت پر انیس اور نظیر اکبر آبادی نے بھی بہت کچھ کہا تھا لیکن انیس کے مراثی میں اُن سے پس منظر کا کام لیا گیا تھا اور نظیر نے انھیں جدت یابی کیلئے استعمال کیا تھا۔ حالی کا نقطۂ نظر بالکل اصلاحی ہے۔

آج ہمارا تنقیدی شعور مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے بہت آگے بڑھ گیا ہے لیکن اس بات کا ہر شخص کو اعتراف ہے کہ جس وقت اُردو تنقید محض زبان و محاورات کی صحت و صفائی کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھی اور شعر کی انتہائی مذمت ابتذال یا عروضی سقم سے اور انتہائی تعریف فکر فلک رس سے کی جاتی تھی، تو حالی نے محاسن و معائب کے فلسفیانہ اصول وضع کئے

شعر کی ماہیت پر غور کر کے سادگی، اصلیت اور جوش کا مطالبہ کیا۔ اس طرح خیال آرائیوں، مبالغوں اور محض لفظی تعمیروں کے لئے کوئی جگہ نہ چھوڑی۔ اصناف ادب میں غزل، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ کی اصلاح کے بہت اہم مشورے دیے اور بہ حیثیت مجموعی اردو شاعری کو تخصیص کوچوں سے نکال کر اجتماعی زندگی کی شاہراہ پر لگا دیا۔ وہ فن برائے فن کے بھی قائل تھے چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری میں ناشری سجانے والے کی مثال دے کر یہی بات واضح کی ہے لیکن فن کو بے لگام چھوڑ دینا اُن سے کوئی تعمیری کام نہ لینا پسند نہ تھا۔ وہ فن کو اخلاق سے ہم آہنگ کر کے اس سے زندگی کی خدمت اور نکھار کا کام لینا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی ادب سے بہت کم آشنا تھے۔ لیکن مغربی اور مشرقی تنقید کے بہت سے مفید نظریوں کو ایک سلوب سے ترتیب دے کر انھوں نے اردو تنقید و ادب کی رہنمائی کی ہے۔ تنقید شعر کی طرح سیرت اور سوانح نگاری میں بھی حالی کا اجتہادی درجہ مسلم ہے۔ اردو میں جدید اصولوں کے تحت سوانح نگاری سب سے پہلے انھوں نے شروع کی۔ اُن سے قبل محض تذکرہ نگاری تھی سوانح نگاری نہ تھی۔ حقیقت میں سوانح عمری کا مقصد کسی اہم شخصیت کی سچی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے جو اس کی زندگی کے واقعات اور تجربات میں جھلکتی ہے۔ تاریخ چونکہ کسی ایک فرد پر تخصیصی توجہ نہیں دیتی اس لئے اس کی زندگی کے بہت سے پہلو دھندلکے میں رہ جاتے ہیں۔ یہ کام سوانح نگار کا ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس کے تمام واقعات کو روشنی میں لائے۔ حالی کے پیش نظر اپنے اور اسلام کے بعض محسنوں کے واقعات

حیات کو ترتیب دینا تھا۔ اس لئے انھوں نے اس طرف توجہ کی۔ شیخ سعدی میں انھیں اپنی طبیعت کی سادگی اور درویشی کی صورت نظر آئی ہوگی۔ اور پھر ترویج اخلاق میں بھی حالی کو سعدیؒ سے بڑی مناسبت تھی۔ اس لئے انھوں نے حیات سعدی لکھی۔ اس کتاب میں سعدی کی زندگی کے واقعات دوسرے ماخذوں سے جمع کئے گئے ہیں صرف تنقید حالی کی ہے اس لئے اس میں وہ حسن وخوبی نہیں جو یادگار غالب اور حیات جاوید میں ہے۔ یادگار غالب ایک شفیق استاد کی داستانِ حیات ہے اور حیاتِ جاوید ایک محسن اور دوست بلکہ ایک صمدی کی سب سے نمایاں شخصیت کے کارناموں کا اعتراف ہے۔ اس لئے ان دونوں سوانح حیات میں خلوص اور محبت کی کارفرمائی ہے پھر یہ دونوں سوانح عمریاں معاصرین کی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے ان کے مواد کی فراہمی میں بھی بڑی آسانی تھی سرسید کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کام سے حالی بہت متاثر و مرعوب تھے اور چونکہ سرسید کے مداح اور مخالف یکساں شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے اس لئے حیات جاوید پر حالی نے بہت زیادہ محنت کی لیکن جس کتاب نے انھیں سوانح نگاری کی دنیا میں مقبول بنایا وہ یادگار غالب ہے۔ یادگار کے بہت سے واقعات اگرچہ بعد کی تحقیق نے غلط ثابت کر دیئے لیکن حالی کا انفرادی طرز تحریر اور غالب کی جیتی جاگتی تصویر دونوں اس میں جلوہ گر ہیں اس کے تنقیدی حصہ پر بھی بہت سی تنقیدیں ہوئی ہیں لیکن اس کی اہمیت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ حیات جاوید کو اگرچہ مولانا شبلی نے کتاب المناقب اور مدلل

مداحی سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ حقیقت میں دونوں رخوں کی کامیاب تصویر ہے۔ اس میں سر سید سے عقیدہ کے باوجود اُن کی ہٹ دھرمی، اُن کی مذہبی بے راہ روی اور ان کی تفسیر کلام پاک پر کڑی تنقید بھی ملتی ہے۔

حالی کے کارناموں کے جائزے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنا بیشتر وقت ہمارے جمالیاتی اور ادبی مذاق کو سنوارنے پر صرف کیا اور قوم کی معاشرتی زبوں حالی کی اصلاح بھی ادب ہی کے ذریعہ سے کی۔ اس لئے ان کے تمام ادبی کارناموں میں ایک طرح کا ربط ملتا ہے اور اُن کی جدید غزلوں، نظموں، مسدس، معاشرتی مضامین، تنقید اور سوانح نگاری سب کے مرکزی مقاصد میں ایک ہم آہنگی ہے۔ ان سب کے نچوڑ میں ہمیں یہ مشورہ ملتا ہے کہ اے مسلمانوں! تمہارا ماضی نہایت زرین تھا لیکن آج تم تباہ حال ہو اور اس تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تم اجتہاد فکر و عمل سے محروم ہو تم نے فرسودہ روایات کو اپنی تقدیر سمجھ لیا ہے تم وقت کے دھارے پر اپنے بیڑے کو آگے نہیں بڑھا رہے ہو۔ اگر زمانہ کی ہوا کی مخالفت کروگے تو زمانہ تمہیں پیچھے چھوڑ جائیگا۔ اٹھو اور وقت کی نبضیں پہچانو۔ نئی زندگی اور نئی معاشرت قبول کرو۔ اپنے اخلاقی نظام کی تجدید کرو۔ سادگی، محبت اور محنت دنیا کو خوشگوار اور عقبیٰ کو سہل بنا دیتے ہیں انھیں اختیار کرو۔ حالی نے ان تمام باتوں کی تلقین کے لئے نظم اور نثر میں جو پیرایہ بیان اختیار کیا وہ نہایت سادہ اور دلنشیں تھا۔ مختصر یہ کہ حالی نے اس دنیا میں ایک صالح زندگی گذاری اور ادب اور زندگی میں صالح قدروں کی تبلیغ و ترویج سے ایک ایسی شمع جلادی جو آج بھی ہماری علمی اور اخلاقی راہوں کو منور کر رہی ہے انکے احسان کا اعتراف ایک فریضہ ہے جسے باقاعدگی سے ادا ہوتے رہنا چاہیئے۔

قیصر تمکین

فکرِ حالی کا سیاسی و سماجی پس منظر

حالی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ ہماری تاریخ کا ایک بہت ہی اہم زمانہ تھا۔ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ معاشی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی اس زمانے کو ہم انتہائی [illegible] مذہب و ناستواری کی حالت میں پاتے ہیں۔ ایک طرف تو کمپنی بہادر کا آفتاب اقبال نصف النہار کی منزل کی طرف تیزی سے گامزن تھا اور دوسری طرف سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ بھڑک کر خاموش ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک [illegible] کے زوال کا یہ افسوسناک منظر ایک ایسی [illegible] جس کا رنگ و نقشہ بازی و ناری سب [illegible] آخری میں اضافہ کچھ اس وجہ سے بھی ہو گیا کہ [illegible] ایک مرکزی قومی حکومت [illegible] مفقود ہو چکی تھی۔

[illegible] ہندوستان بھی صنعتی دور کی آمد آمد کے اثرات سے [illegible] مغرب نے کوئی تیس تکلیں [illegible] پہلے عام انسانی

شہ پاروں سے علاوہ بھی کچھ اور بھی ہو سکتا ہے نئے ادبی امکانات سے روشناس ہونے لگی تھی دوسری طرف علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار اور اس کے بعد سرسید کے اخبار "تہذیب الاخلاق" نے مغربی ادبیات کے چند نمونے وہاں کے اخلاقی اور ادبی معیاروں کے خاکے پیش کر کے فکری اور ادبی انداز نظر میں تبدیلی کا بار بار احساس کرایا تھا۔

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ تبدیلی کی خواہش اور نئی شاعری کی ضرورت کا احساس علمی حلقوں میں عام ہو چلا تھا لکھنؤ میں عام طور پر اور دہلی کے زیر اثر حلقوں میں کہیں کہیں لفظی صناعی سے بھرپور اور خیال بندی اور مضمون آفرینی سے معمور شاعری مروج تھی ناسخ اور آتش، رند اور رشک کے زیر اثر جو فنی باریکیوں اور پرانے مضامین کو نئی لفظی سج دھج سے باندھنے کی روایت پروان چڑھی تھی وہ اب بھی مشاعروں میں دھوم مچائی تھی چند چھوٹے موٹے درباروں اور ریاستوں کے عمائدین کے دیوان خانوں میں اب بھی قدیم طرز شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔

لکھنؤ کا ورق زمانہ تہ کر چکا تھا اور محاوروں سے مزا لینے لفظی کاریگری پر پھڑک اٹھنے یا ہر قافیے کو باندھنے اور مشکل ردیف کے ساتھ دو غزلے اور سہ غزلے لکھنے کا رواج کم ہو گیا تھا ہاں داغ نے لکھنؤ کے زیر اثر زبان کے چٹخارے اور معاملہ بندی کو دہلی کی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ ملا کر جو مزیدار نشاطیہ لہجہ پیدا کیا تھا وہ اس دور کی قدیم شاعری پر فتح پا رہا تھا ہر مشاعرہ انھیں کے ہاتھ رہتا رام پور کا دربار ہو یا حیدرآباد کی ادبی محفلیں

داغ کی غزلیں ہر جگہ قبول عام کا سکہ جما رہی تھیں[1] انتہا یہ ہے کہ لکھنؤ کی ثقیل وثقہ ادبی روایت میں پرورش پائے ہوئے شعراء نے بھی اسی رنگ کو اپنانے کی کوشش کی امیر مینائی نے تو ناسخ اور رشک کے اثر کے باوجود عشقبازی اور سرمستی کے لکھے ہوئے مضامین داغ ہی کے انداز میں باندھنے شروع کر دیئے ہاں جلال لکھنوی نے پھر بھی ایک طرف لکھنؤ کی صناعی کو کسی تک قائم رکھا اور دوسری طرف میر سے اثر قبول کر کے دہلی کے سوز و گداز اور داخلی رنگ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

درباروں کے چراغ گل ہوئے۔ لکھنؤ کے بعد رامپور اور دوسری ریاستوں کی ادبی محفلیں اجڑیں ادبی فضا میں خلا کا احساس پیدا ہونے لگا لیکن ۱۸۷۴ء کے مشاعرے میں عملی طور پر مولانا محمد حسین آزاد کے لکچر میں نظریاتی طور پر تبدیلی کا اعتراف ہی نہیں کیا گیا بلکہ تبدیلی کی ضرورت اور اسکی سمت بھی کسی حد تک متعین کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ آزاد کی شاعری جو بقول ان کے "حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے" ہمارے شعری ذخیرے کی صف اوّل میں جگہ نہ پا سکی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے لکچر اور انکی عملی سرگرمیوں نے ایک تاریخی کارنامہ سر انجام دیا اور اردو شاعری کے سامنے ایک نیا معیار پیش کیا حالانکہ ان کی شاعری خود بھی اس معیار کو پوری طرح نہ برت سکی۔

حالی نے ۱۸۷۴ء کے مشاعرے میں اپنی نظم پڑھی اس مشاعرے میں مصرعہ طرح کے بجائے نظموں کے لیے عنوان مقرر کئے گئے تھے یہ گویا

حالی کا نام بجا طور پر اس طبقے کی نمائندگی کے لئے لیا جا سکتا ہے اسکی وجہ نہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی سرد و گرم کا مزہ چکھا تھا بلکہ اس میں بھٹک کر جو لوگ رہ گئے تھے ان کے لئے انھوں نے ایک راہِ عمل تجویز کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں ان سے بہت کچھ امید کرنا نہ صرف فضول بلکہ ایک طرح کی ناانصافی بھی ہے ادیب ہمیشہ ماحول کی پیداوار ہوتا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں وہ خود ماحول کو بدلنے میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں) اس لئے ادیب کو ماحول سے الگ کر کے اس کو دیکھا جائے تو اس کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

حالی کے ذہنی و فکری ارتقا کو سمجھنے کے لئے بالکل فطری طور پر ان حالات کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے جن میں گھر کر حالی نے نہ صرف یہ کہ اپنا راستہ بنایا بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی ایک واضح راہ عمل متعین کی۔ حالی نے غدر سے پہلے کا ہندوستان دیکھا۔ غدر کے ہنگامے اور مابعد اثرات کو بھی دیکھا اور برطانوی حکومت کے استحکام سے بھی متاثر ہوئے۔ سیاسی طور پر یہ تینوں مختلف حالات تھے مگر ان ہی تینوں کی واضح چھاپ ہمیں حالی کے ذہن پر ملتی ہے۔ وہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ اس طرح انھوں نے بیس سال کی عمر میں ہی ایک زبردست انقلاب کا سامنا کیا چونکہ وہ ابتدا ہی سے ہی علم و فضل میں شغف رکھتے تھے اس لئے ان کا ذہن حالات کی سنگینی کا احساس کرنے کے لئے اس عمر میں بھی کافی باشعور تھا۔ ملک کی سیاسی تبدیلیاں ان کے شعور میں غیر معمولی تغیر و تبدل کی محرک بن گئیں۔ وہ ذہنی لحاظ سے

ایک غزل گو شاعر کے بجائے حالی ایک سیاسی مصلح بن گئے

مگر اس کو بھی ایک حد تک نہیں کہا جا سکتا۔ حالی کے ذہن و فکر نے سیاسی و اخلاقی اصلاحات کی شکایات نے عصر ایک بہتر راستہ منتخب کرنے کی کوشش کی تھی اگر ان حالات آزادی کے دور میں بھی وہ محض غزل سرائیوں میں ہی مصروف رہتے تو ان کے ایسے نا شعور انسان جو حالات سے آنکھیں چرا لے کا مجرم قرار دیا جا سکتا تھا۔

حالی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ قدامت پرستی کا دور تھا جدید علوم جہالت اور بے دینی کا ہی کو تعبیر کیا جاتا تھا۔ ابتدائی برسوں میں انھوں نے ... علوم متداولہ میں دستگاہ حاصل کی حافظ قرآن ہونے کے بعد انھوں نے فارسی ادب کا استیعاب کر لیا عربی زبان و ادب سے واقفیت حاصل کی اور صرف و نحو کی تعلیم مشہور عالم حاجی ابراہیم سے پائی۔ گھر والوں سے روپوش ہو کر جب وہ اپنی تشنگی علم بجھانے کے لئے دہلی گئے تو اس وقت کے تمام عالموں کا صحبت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر مطالعہ الگ ہوگیا ۱۸۵۵ء تک جاری رہا ۔ اسی اثنا میں انھوں نے دہلی میں غالب سے بھی ملاقات کی اور شعر کہنا شروع کر دیا اور مروجہ علوم قدیم اور ادب سے فراغت پا کر انھوں نے خود

علا محنوں ... نے اس بات کو ایک عبرتناک دھبہ اور ادبی معمول کا پانچ ... سمجھا ہے۔ نقوش در نگار صفحہ ۲۰۶۔

ملا حالی کا تعلق سرسید اور علی گڑھ سے ۔ از صالحہ عابد حسین

اپنی ذاتی کوششوں سے جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کی بھی کوشش کی قدامت پسندی و روایتی آداب کی فضا میں پرورش پانے والے کا یہ قدم بجائے خود ایک انقلابی نوعیت کا حامل ہوتا ہے کہ وہ رسم و رواج کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھنے کی کوشش کرے۔

ممکن ہے کہ حالی کی غزل گوئی اسی صحبت و تعلیم کا نتیجہ ہو جو ابتدائی برسوں میں ان کو میسر آئی اور مروجہ قواعد و روایتی نصاب وغیرہ کا نہ ہی ان کو ایک غزل گو شاعر بنانے میں معاون رہا ہو یہ بات اتنی اصفائی سے یوں کہی جا سکتی ہے کہ خود حالی نے لکھا ہے کہ عشقیہ شاعری ان کی واردات قلبی کی عکاس نہ تھی بلکہ محض تقلیدی شاعری تھی۔ یہ ان کا زبردست احساس و شعور ہے جس کی بنا پر وہ بڑی جرأت سے لکھتے ہیں۔

"البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا
ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک
اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا ۔ وغیرہ

آخر میں لکھتے ہیں۔

"جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہو کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں"

جس وقت حالی اس منزل جنوں سے گذر رہے تھے اسی زمانے میں ہندستان ذرا سنبھالا لے چکا تھا سرسید اور انکے رفقاء کو دوبارہ قوم کی قدر اور ایک شکست خوردہ ذہنیت کو امید افزا پیغام دینے کا خیال پیدا ہو چکا تھا حالی

اس فکری زوال کی زد سے نہ بچ سکے انھوں نے غزل کو سماجی اور اجتماعی مسائل و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دربار، دورِ بارداری ماحول، محض انفرادی زندگی و جذبات اور جاگیردارانہ نظام کی فضا و نفسی کیفیات کو حالی کے طرزِ سخن نے سرباد کہا یا زمانہ اور نئے مسائل واقعی آرہے تھے یا نہیں یہ بات دوسری ہے مگر حالی کی نوائے شاعری ایک نئے زمانے کی پیغامبر ضرور بن گئی تھی۔ سرسید کے بارے میں ان کے لہجے میں قدرے ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا لیکن عملی طور پر واقعی کیا کیا تھا اس کے بارے میں وہ خود بھی کچھ طے نہیں کر پارہے تھے وہ قدیم و جدید میں سے کسی ایک کے بھی یکسر مخالف یا موافق نہیں تھے۔ عملی زندگی میں انھوں نے انگریزوں کی ملازمت بھی کی تھی جس کے یہ معنی نکالے جاسکتے ہیں کہ ان کے ذہن میں انگریزوں کے خلاف وہ تلخی و برگشتگی نہیں تھی جس سے اس زمانے کے متوسط طبقے کا کوئی فرد بھی خالی نہیں تھا انھوں نے انگریزی حاکموں کے مظالم بھی دیکھے تھے اور یہ بھی دیکھا تھا کہ کس طرح محض تیشہ دستے پورے ملک کے جذبہ آزادی کو کچل ڈالا گیا تھا اس بارے میں ان کی خاموشی تقاضائے مصلحت تھی یا کچھ اور ...؟

اس کی وجہ جاننے کے لئے حالی پر سرسید کے اثر کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے فکر و عمل پر سرسید کی تبدیلیوں کا گہرا نقش تھا اس کو ان کی ذہنی کشمکش و آزردگی سے بچانے میں سرسید کا بڑا ہاتھ تھا اگر یہ ارتباط پورے پس منظر کے ساتھ نہ سمجھی جائے تو خود حالی کے ذہنی ارتقا کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

سرسید حالات سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ انھوں نے پوری بے باکی سے حقیقت حال کو نہ صرف یہ کہ سمجھا بلکہ دوسروں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی دوسری طرف ان کے ساتھ آزاد کے ایسے لوگ بھی تھے جو عوام کو اس امر کی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ "نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں اور ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہے۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔"

مغرب سے استفادہ کرنے کی یہی رو تھی جس نے چپ چاپ مغرب کے سیاسی نظام کو قبول کرنے اور انگریزی نوکر شاہی اور استعماریت سے صلح کرنے پر لوگوں کو مجبور کر دیا۔ اس کام میں عوام کی اپنی کوئی کوشش شامل نہیں تھی بلکہ یہ ذہنی و فکری رد کی قیادت متوسط طبقے کے ہاتھ میں سونپ دیئے جانے کا نتیجہ تھا۔

کارل مارکس نے ہندستان میں انگریزی عمل داری کا تجزیہ کرتے ہوئے نئی تعلیم۔ اخبارات کی آزادی سیاسی وحدت و اتحاد ملکی فوج اور ذرائع آمد و رفت کی آسانیوں پر بڑے معنی خیز طریقے پر زور دیا ہے۔ بلاشبہ یہ برکتیں ہندوستان کو برطانی حکومت سے ورثے میں ملیں مگر مارکس نے بڑی صحیح ان کو سمجھا اور ان کے عواقب کا احساس کیا اس طرح ہوا [illegible] طبقہ عوام تک سمجھ اور محسوس نہیں کر سکا تھا۔ [illegible] راج نے جان بوجھ کر ہندوستان کو ایسا بڑا صنعتی ملک [illegible]

ریہاں اپنے استحصالی نظام کے مفاد کی خاطر سامنت شاہی کو برقرار رکھا۔
مگر ہمارے باشعور طبقے کا خیال تھا کہ جو بھی جدید ہندیتیں ہم کو برطانی راج میں
ہیں ان سے ہم کو خاطر خواہ مستفید ہونا چاہیئے اور جن مادی ترقیوں کی طرف
سربی جاگی ہوئی قومیں بڑھ رہی ہیں ہم کو بھی ان کی طرف چلنا چاہیئے
ترقی کے یہی معنی و مفہوم ہیں جن کی طرف حالی نے مسدس میں
شارہ کیا ہے۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجہ سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
کرو قدر اسی امن و آزادگی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہ ترقی
ہر اک راہرو کا زمانہ ہے ساتھی یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دہشت کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ ملک کے پاس عام طور پر اور مسلمانوں کے
ں خاص طور پر اس سیاسی پراگندگی اور انتشار کا حل ہی کیا رہ گیا تھا۔ یہ
یح ہے کہ باشعور طبقہ تاریخ کے معاشی ارتقا اور سماجی ڈھانچے کی پیچ در پیچ
ں سے ناواقف تھا۔ تاریخی انقلابوں کے محرکات معاشی عوامل ہوتے ہیں

اور الگ الگ معاشی مفادات کی وجہ سے ہی مختلف سماجی طبقات میں باہمی نزاع رہتی ہے۔ یہی طبقاتی کشمکش تمام تاریخی جنگوں اور انقلابات کی بنیاد رہی ہے۔ مسٹر سرسید نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو تاریخ کا ناگزیر عمل نہیں سمجھا وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ جاگیردارانہ نظام مفلوج ہو گیا تھا او تاریخی ضرورت کے طور پر اس کی جگہ پر ایک مشینی سرمایہ داری کا نظام آرہا ہے۔ انھوں نے غدر کو محض ایک فوجی بغاوت ثابت کرنے کی پوری کوشش کی اور ان کے اتباع میں حالی نے یہ یقین کر لیا کہ مسلمانوں میں چونکہ حکومت کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی تھی اس لئے انگریزوں کو اس سے فائدہ اٹھانیکا موقع ملا اس کے علاوہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت یا ان کی مخالفت کو ایک بالکل ہی فضول کوشش سمجھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے ——؟

ظاہر ہے ہندستان کے حالات ایسے تو تھے نہیں کہ ایک سیاسی جماعت کی تنظیم کرکے انگریزوں کو نکالا جاتا یا کسی بڑی بغاوت کی سازش کی جاتی اس کا متبادل راستہ یہ تھا کہ مایوس اور ناامید ہو کر بیٹھ رہا جاتا مگر یہ سب سے زیادہ مضرات ہوتی اس دور کے فہیم طبقے نے تیسرا راستہ انگریزوں سے مصالحت کرنے کا نکالا نظم ونثر دونوں میں حالی نے اسی بات پر زور دیا کہ ہم کو زمانے کی رو کے ساتھ چلنا ہے مسدس کی دوبارہ اشاعت کے وقت انھوں نے جو ضمیمہ شامل کیا اس میں جگہ جگہ قوم و ملک کے علاج کے لئے نسخے تجویز کئے ہیں اور اکثر جگھوں پہ انھوں نے احادیث و آیات کے پوٹے پوٹے

بے جے کر دیئے اور اپنی رائے کو احادیث و آیات کی رو سے جائز و صائب ثابت
رنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ حَیْثُ وَ
جَدَ ھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا یا پھر اَلَا اِنَّ الدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ مَلْعُوْنٌ مَا فِیْھَا اِلَّا ذِکْرُ
اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ وَعَالِمٌ وَّ مُتَعَلِّمٌ کے لفظی ترجمے کرتے وقت ان کے ذہن میں
علم و حکمت کا وہی مفہوم تھا۔ جو سرسید اور ان کے رفقا نے سمجھا تھا مسدس
میں انھوں نے لکھا ہے۔

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاو ساماں ... کہ نسلیں تمھاری سنیں جن سے اساں
غریبوں کو راہ ترقی ہو آساں ... امیروں میں ہو نور تعلیم تاباں

....

....

بیٹے قوم کھانے کمانے کے قابل ... زمانے میں ہو منھ دکھانے کے قابل

....

مختصراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ سماجی و سیاسی امور میں حالی کا ذہن ترقی اور رجعت کے متضاد رجحانات کا حامل ہے وہ ایک طرف تو انگریزی راج کی تائید کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کے بھی بڑے پر زور حامی اور وکیل ہیں اس کے علاوہ کانگرس کی سیاسی تحریک کے مخالف ہوتے ہوئے بھی سودیشی تحریک کے موافق ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاسی۔ سماجی حالات کی پیچیدگی میں انھوں نے راہ راست اختیار کیا۔ وہ اعتدال و اصلاح پسند ہی تھا مگر یہ ضرور ہے کہ انھوں نے متوسط طبقے کے

خاموش ناجانبداری کی پالیسی کو پسند نہیں کیا یہ بجائے خود اپنی جگہ پر ایک بڑا مجاہدانہ اقدام تھا وہ اپنے اسی فعل سے شعوری طور پر واقف بھی تھے۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ تو کرنا بہر حال بہتر ہے اسی سلسلے میں مسدس کے پہلے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گذرتے ہیں ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے اور دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیئے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔

در قفس ست منشیں از کشاکش نا امید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا"

اسی خیال نے ان سے مسدس مد و جزر اسلام لکھوایا۔

مگر ادب میں حالی کا کردار ایک مجتہدانہ شان لئے ہوئے ہے یہاں وہ کسی کشمکش۔ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کے شکار نہیں ہیں۔ مغربی طرز نگارش سے غالباً وہ پہلے اردو ادیب ہیں جس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے یہاں کوئی ابہام یا پیچیدگی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی بنیادی طور پر ادیب تھے سماجی و سیاسی حالات کے ہاتھوں وہ ایک مصلح قوم بھی بن گئے سیاست و اصلاح قوم کی دشوار گذار راہوں میں وہ کوئی دو ٹوک بات ممکن ہے کہ نہ کہہ سکتے ہوں مگر ادیب کی حیثیت سے وہ نئے زمانے نئے مسائل نئے امکانات اور نئے جہان و مکاں کی بدولت ہی خوبی [illegible] مقدمہ

شعر و شاعری میں انھوں نے ایک بات صفائی سے کہی ہے: "وہ شعر و قصائد کے ناپاک دفتر کو یکسر قابل استرداد ٹھہراتے ہیں اور جہانِ شعریت میں نئے مضامین و نئے انداز فکر و اسلوب کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب وہ خالص ادبی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے تو ملک میں ایک طرح کا سیاسی سکون پیدا ہو چکا تھا اور علی گڑھ کالج کی تعلیم نے مسلمانوں کے نئے علمی و مادی ترقیوں کے دروازے کھول دیے تھے ۱۸۹۳ء میں جب ان کا دیوان مع مقدمہ شعر و شاعری کے شائع ہوا تو ملک سیاسی دباؤ اور رعیتوں کی ہلاکت خیزیوں سے گزر چکا تھا۔

حالی کی بنیادی حیثیت ایک ادیب و شاعر کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو ادب کے دور جدید کے بانی اور موجد تھے اردو میں انتقادی ادب اور شعر و سخن کی نشاۃ ثانیہ تمام تر انہی کی مرہون منت ہے انھوں نے ایک طرف تو نثر میں کچھ بنیادی شعری اصول متعین کئے اور زبان و ادب کے شعری سرمائے کو اپنے معیار[۱] سے جانچا اور دوسری طرف نظم میں ان اصولوں کو بڑے سلیقے سے برت کر دکھایا۔

اس طرح ہم حالی کو جب ان کے زمانے کے سماجی سیاسی اور

---

[۱] اس سلسلے میں ن م راشد کا یہ کہنا کہ "حالی کے پاس انتقادی قدروں کے سوا ادب کو جانچنے کا کوئی اور معیار نہ تھا" غیر منصفانہ ہے یہ غلطی حالی کی نہیں بلکہ ان حالات کی ہے جن میں حالی بسر کر رہے تھے ان کا کارنامہ تو یہی ہے کہ انھوں نے پہلی بار ادب کو جانچنے کی کوشش کی۔

ادبی پس منظر میں رکھ کر کوئی نتیجہ نکالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے رہنما تھے جن کے سامنے کوئی شاہراہ نہیں ہوتی ہے بلکہ دشوار گذار جنگلوں اور خارزاروں سے گذر کر اس کو خود ہی ایک راستہ نکالنا پڑتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اسے دوسروں کو اس راہ پر گامزن کرنے کے لئے آمادہ بھی کرنا پڑتا ہے اگر ان کی مشکلوں کو سامنے رکھا جائے تو ایک بات تو واضح طور پر معلوم ہوگی کہ وہ رجعت، قنوطیت، جمود، یاس، قدامت پسندی اور تنگ نظری کے عیوب سے قطعاً پاک تھے۔ وہ ایک سنجیدہ عالم، ایک ہمدرد مصلح، ایک ٹھوس حقیقت پسند اور ایک متین صاحب طرز ادیب تھے۔ دنیا اور اس کی تبدیلیوں کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کی اہلیت جتنی ان میں تھی ہمارے یہاں اب بھی نہیں ہے۔ بقول اثر کاکوروی کے "مصلح، نقاد ادب کی حیثیت سے تبار کا مرتبہ ایک قائد اعظم کا ہے۔ ان کا زبردست شعور تھا جس نے زمانے کے ساتھ نہ صرف یہ کہ خود کو بدلا بلکہ زمانے کو بھی موافق حالات میں ڈھال کر رکھ دیا ———"

اقبال کا یہ قطعہ کتنا سچ ہے۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد سید دگرش ورانی از شاخ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

مس قدسیہ غالب ملیح آبادی

حالیؔ وحدت میں کثرت

تاریخ ادب اردو پر ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہمیں بہت سے بلند پایہ ادیب، خوش فکر شاعر، وسیع النظر مورخ، باکمال نقاد اور سنجیدہ سوانح نگار ملتے ہیں۔ ان میں کوئی اپنی شاعری سے دلنواز نغمے چھیڑ رہا ہے کوئی زور لسانی سے گلشن ادب میں گل کھلا رہا ہے کوئی اپنے فلسفیانہ تخیل کے سہارے ستاروں سے بھی آگے ایک جہاں تلاش کر رہا ہے، کوئی سرحد فہم و ادراک سے پرے ایک معبود ڈھونڈ رہا ہے، کوئی اپنے ملکۂ نقد کے ذریعے قعر گمنامی میں پڑے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے کمالات فن کو آشکار کر کے انھیں آسمان شہرت پر پہنچا رہا ہے، کوئی اپنے تبحر علمی اور وسیع معلومات کے ذریعہ تاریخ کے سچے اور جھوٹے واقعات کے درمیان حد امتیاز قائم کر رہا ہے تو کوئی سوانح نگار اپنے پسندیدہ شاعر یا مصنف کے

حالاتِ زندگی، اس کے کردار اور اس کے شاہکار کو روشنی میں لا رہا ہو
لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ہر میدان کا شہسوار ہو۔ علامہ
شبلیؒ اور سرسیدؒ کی شخصیت میں ضرور ہمہ گیری ہے۔ شبلی بیک وقت
مورخ، ناقد، سوانح نگار، شاعر، ادیب، مصلح اور انشاپرداز تھے
لیکن حالی کے مقابلے میں نہ تو وہ شاعری میں آگے جا سکے اور نہ
تنقید میں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تاریخ تک محدود ہو کر رہ گیا
ہے سوانح عمری کے لئے خود فرماتے ہیں

"جب تک کافی موادِ تحریر نہیں ہوتا میں ایک قدم نہیں
چل سکتا۔ لیکن حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں،
ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت اس جگہ سے مواد
نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمالِ
اجتہاد کی دلیل ہے۔"

سرسید نے بھی مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا لیکن معقولات کو
چھوڑ کر تنقید اور سوانح نگاری کے میدان میں قدم بھی نہیں رکھا
شاعر کی حیثیت سے بھی وہ اپنا کوئی خاص مقام نہ پا سکے لیکن
ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے معتقد، شیفتہ سے مستفید اور میر کے مقلد
خواجہ الطاف حسین حالی کی شخصیت میں بے پناہ ہمہ گیری ہے ان
کی وحدت سے کثرت کی شعاعیں پھوٹتی ہیں جو نثر کو بھی روشنی
بخشتی ہیں اور نظم کو بھی جس کی کرنوں سے تنقید کا بیج نشو و نما پاتا ہے

اور جس کی حرارت سوانح نگاری کو جنم دیتی ہے دنیائے ادب میں بہت
سی ایسی ہستیاں ہیں جو شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی لیکن ان میں سے
بعض کی نثر نظم پر چھائی ہوئی ہیں اور بعض کی نظم نثر پر۔ چنانچہ آزاد
پہلے انشا پرداز ہیں پھر شاعر۔ غالب پہلے شاعر پھر مکتوب نگار
ہیں شبلی پہلے مورخ اور پھر شاعر، اسی طرح سے سرسید پہلے
مقالہ نگار اور پھر شاعر ہیں لیکن سعدی ہند حالی کے بارے میں
شیخ سعدی کی طرح یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ پہلے کیا ہیں؟ ان کی نظم
کو ان کی نثر پر اور نثر کو نظم پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں
نہیں آتی۔ نثر و نظم دونوں میں ان کے کارنامے بلند پایہ ہیں اگر
"مسدس" نے قوم کے انداز فکر کو بدل دیا تو "مقدمہ شعر و شاعری" نے
شاعری کی جھوٹی بنیادوں کو ہلا دیا۔ اگر "مسدس" نے قوم کو جھنجھوڑ کر بیدار
کر دیا تو "مقدمہ شعر و شاعری" نے شعراء کے تخئیل کو روایتی عشق کی
زنجیروں سے آزاد کرا دیا۔ تنقید نگاری کی ترقی کے تین مدارج ہو سکتے
ہیں اول تو یہ کہ نقاد اپنی ٹھوس اور مدلل تنقید کے ذریعہ کسی ایک شاعر
یا ادیب کے متعلق عوام کی رائے بدل دے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ نقاد
اپنے ملکۂ نقد کے ذریعہ نہ صرف اپنی شاعری بلکہ دیگر شعراء کی قدیم روایات
کو بدل کر شاعری کو نئی اور صاف راہوں پر لا ڈالے جس سے اس کی ترقی
کی راہیں وا ہو جائیں۔ تیسرا اور آخری درجہ نقاد کے کمالِ فن کا یہ
کہ وہ سیکڑوں دشواریوں اور ہزاروں مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر

پوری ادبی روایات کو یکسر بدل دے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" اور یادگار غالب میں حالی نے یہ مدارج بڑی کامیابی کے ساتھ طے کئے ہیں۔ انھوں نے "یادگار" کے ذریعہ غالب کو شہرت عام بخشی۔ عبدالشکور صاحب نے غالب کے کلام اور عبدالرحمٰن بجنوری کی تصنیف "محاسنِ کلام غالب" کا ذکر کرتے ہوئے غالب کا ایک شعر پیش کیا ہے ع

جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں: خود بجنوری اور "محاسن کلام غالب" پر اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے جب تک بجنوری کی یہ تصنیف نظر سے نہ گذری تھی دنیائے ادب غالب کے معجز نما کلام کی خوبیوں سے ناواقف تھی۔ بجنوری نے ہم سب کو معتقد فتنۂ محشر کیا۔ ہم سب ان کے اس کرم کے شکر گذار ہیں مگر میں شکور صاحب سے یہ کہنے کی جراُت کروں گی کہ یہ کام بہت پہلے مولانا حالی کے ہاتھوں انجام پا چکا تھا۔ حالی "یادگار" کے ذریعہ اس فتنہ کو بجنوری سے بہت پہلے بیدار کر چکے تھے۔ ہاں بجنوری نے جاگتے ہوئے کو جھنجھوڑ ڈالنے کا کام ضرور انجام دیا۔ حالی کی "یادگار" نے ایک باکمال شاعر کی خصوصیات کو اجاگر کیا اور ان کی "مقدمہ شعر و شاعری" نے ادب کی قدیم روایات کو یکسر بدلکر نثر میں بھی "مسدس" کا ہم پلہ کارنامہ قائم کیا۔ اور ادب نوازوں کے لئے یہ اختلافی بحث ہمیشہ کے لئے قائم کردی کہ وہ ان کو بحیثیت شاعر زیادہ بلند مرتبہ

دیں یا بحیثیت نثر نگار۔ لیکن ہم یہاں اس بحث میں پڑنے کے بجائے ان نثر و نظم دونوں کارناموں پر سرسری نظر ڈال کر فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑ دیں گے خواہ وہ حالی کو بحیثیت نثر نگار اعلیٰ مرتبہ دیں خواہ بحیثیت شاعر۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حالی کی واحد شخصیت میں کثرت کے جلوے پوشیدہ ہیں ان کے قلم کی سیاہی سرسید، شبلی، نذیر احمد، شیفتہ میر، درد، غالب اور شیخ سعدی کی سیاہیوں سے ملکر بنی ہے وہ نثر و نظم میں اپنے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لہٰذا ہم ذرا تفصیل کے ساتھ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالیں گے مگر قبل اس کے کہ ان کی نثر و نظم پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا جائے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ سب کچھ ہونے سے پہلے مصلح ہیں اور ان کی یہ شان ہر جگہ نمایاں ہے وہ اپنے وجود کو بھول سکتے ہیں لیکن اپنا اصلاحی مقصد کبھی پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ بحیثیت مصلح قوم وہ غزل، مثنوی، مسدس، رباعی، قطعہ، قصیدہ، سوانح نگاری اور تنقید نگاری غرضکہ ہر جگہ بے نقاب ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی چند مثالوں سے خصوصیت واضح کر دی جائے، ان کا یہ اصلاحی پہلو کہیں نمایاں ہے اور کہیں بلاغت کے ستر پردوں میں نہاں اقبال کے پیغام عمل اور پیغام خودی کی طرح سے حالی کا مصلحانہ انداز ان کے کلام میں کہیں بالواسطہ اور کہیں بلا واسطہ ملتا ہے ع

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے

سچ کو تحریر میں پاؤ گے نہ تقریر میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

غزلیات میں فرماتے ہیں ع

افسوس اہلِ دیں بھی مانند اہلِ دنیا
خود کام خود نما خود بیں ہیں اور خود آرا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہو گا گر وزن کم تمہارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گزرا ہے ابھی یاں سے خیل و حشم تمہارا

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گویا دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

رباعی میں فرماتے ہیں ع

احساں کرے ہے گر صلے کی خواہش تم کو   تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو

کرتے ہو گر احساں تو کر دو اسے عام   اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنوں نہ ہو

حالی نے جس وقت بزمِ شاعری میں قدم رکھا اس وقت اس پر ایک خاص قسم کا انحطاط چھایا ہوا تھا۔ شعراء تڑپتی مچلتی زندگی سے منہ موڑ کر ادب کے دامن میں پناہ لے چکے تھے۔ ان کے سیاسی، سماجی اور تمدنی حالات پر انقلاب برپا تھا مگر وہ اس انقلاب سے بے پرواہ اپنے دردِ عشق میں مبتلا تھے ان کے ہونٹوں پر خیالی محبوبوں کی جفاؤں کی داستان تھی۔ شاعری کی روح مر چکی تھی مگر شعراء لاش کو اپنے کاندھوں پر لادے گھوم رہے تھے یوں سمجھنا چاہیے کہ شاعری میں جوانی تھی مگر رعنائی ختم ہو چکی تھی۔ ساز تھا پر سوز ختم ہو چکا تھا خیال آرائیاں تو تھیں لیکن تاثیر ناپید تھی۔ زبان کی دلکشیاں ضرور موجود تھیں لیکن لیلائے معنی روپوش ہو چکی تھی مبالغہ اور دور از کار تشبیہات کا بازار گرم تھا غرض کہ حالی نے جب آنکھ اٹھا کر اپنے گرد و پیش دیکھا تو عاشقوں کی محفلیں سجی ہوئی تھیں میخانہ کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اصنامِ خیالی سے کعبہ بسا ہوا تھا۔ کوئی عشق کے نشے میں الاپ رہا تھا کوئی میخانہ میں جھوم رہا تھا اور کوئی خیالی محبوبوں کے سامنے جبیں سائی کر رہا تھا لیکن حالی کو وہاں کوئی سر ایسا نہ دکھائی دیا جو اسلاف کے کارنامے نمایاں پر فخر سے بلند ہوتا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ ملی جو ملت کی تباہی پر اشک آلود ہوتی اور کوئی دیوان ایسا نظر نہ آیا جس میں قوم کے

تمام کوئی پیغام ہوتا۔ شعراء کی نظر میں کائنات سے ہٹ کر عاشقوں کے
دل پر جم چکی تھیں اور وہ ان کے تلو کی ترجمانی مختلف طریقوں سے کر رہے
تھے۔ عشق کا مرکز معشوق کی ذات بنی ہوئی تھی اور شاعری کی ساری روح
سمٹ کر غزل کے پیکر میں سماگئی تھی۔ یہ تو تھا شاعری کا حال۔
ادھر مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالت دگرگوں تھی۔
ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا اور نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ
تمام ہندوستانی قوموں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ سیاست کی بساط
پر مسلمانوں کا حال پٹے ہوئے پیدل کا سا تھا۔ خودی و خودداری اِن
کے دلوں سے حرف غلط کی طرح مٹ چکی تھی۔ ضمیر کی آواز دل کی
گہرائیوں میں محو خواب تھی۔ اسلام کا سیدھا راستہ ان سے چھوٹ چکا تھا
دنیاداری حد سے بڑھ چکی تھی موت کا خوف دلوں کو لرزاں کئے
ہوئے تھا ایسے حالات میں ضروری تھا کہ کوئی طبیب ماہرانہ انداز
سے قوم کے اس پھوڑے کو چاک کر دیتا۔ قوم کی مسیحائی کے لئے فطرت
کی نظر انتخاب حالی پر جم کر رہ گئی لیکن حالی اپنے اس انتخاب سے بےخبر
جب بزم شاعری میں داخل ہوئے تو بقول ڈاکٹر عابد حسین وہی
رنگیلا راگ گانے لگے۔ یہ راگ تھا ہی بڑا رنگیلا لہذا کافی عرصہ تک
حالی اس کو الاپتے رہے لیکن وہ وقت بھی آخر آ ہی گیا، جب
جھوٹے راگوں کا یہ جادو سر سے اتر گیا۔ قدرت کے ہاتھوں نے
بڑھ کر آئینہ شاعری سے تصنع و بناوٹ کی گرد کو صاف کر دیا اب

حالی کو اپنی بے مصرف شاعری کا چہرہ صاف صاف نظر آ گیا۔ لہذا ان کو اپنی ساری شاعری نکمی معلوم ہونے لگی اور وہ اس سے گریزاں ہو گئے۔ ان کو اپنی عمر عزیز کا ضایع ہونا بہت شاق گذرا" مسدس" کے دیباچے میں اپنی شاعری کی تعریف بڑے تمسخرانہ انداز سے کرنے کے بعد نہایت افسوس کے ساتھ لکھا ہے :" غرضکہ نامۂ اعمال کو ایسا سیاہ کیا کہ سفیدی کہیں باقی نہ بچی"۔ حالی کو اپنی اس بھول، اپنی اس غلطی کا بڑا ملال تھا۔ لیکن ہمارے خیال میں ان کی یہی بھول اور یہی غلطی ان کے مستقبل کی کامیابی کی ضامن بن گئی۔ رندوں میں رند بنکر ہی کامیابی آسانی کے ساتھ حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر حالی شاعروں کے عام رنگ کو پہلے اختیار نہ کر چکے ہوتے تو ان کی اصلاحی شاعری کو بار آور ہونے میں اور بھی دیر لگتی۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب اپنے ہی رنگ میں رنگا ہوا اپنی محفل کا کوئی انسان اٹھ کر کوئی نئی بات کہہ دیتا ہے تو وہ دلوں پر اس مقرر کی بات سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جو کہیں باہر سے آیا ہو۔ بزم شاعری میں پرانے مغنی کی حیثیت سے حالی کو سب جانتے تھے سب ان کو پسند کرتے تھے لیکن جب اسی پرانے مغنی نے نئے راگ چھیڑے تو آہستہ آہستہ یہ بھی لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہوئے گو کہ شروع میں حالی کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کے ہمنوا گلشن میں پیدا ہی ہوتے گئے۔

حالی کی طبیعت جیسا کہ سید سلیمان ندوی کہتے ہیں بہت گداز تھی۔

"شاعر کی طبیعت بہت گداز تھی وہ ازل سے دردمند دل لیکر آیا تھا اس کا مزاج سدا کا اداس تھا وہ عالم کی نیرنگیاں زمانہ کی ناسازگاریاں اور پھر قوم کی پستی کا منظر دیکھ دیکھ کر خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا تھا۔"

ان کے کلام کا جائزہ بتاتا ہے کہ جب وہ شاعری کے عام دھارے کے ساتھ بہہ رہے تھے اس وقت بھی ان کے کلام میں انفرادیت بھی پائی جاتی ہے اور سوز و گداز بھی۔ انھوں نے بوالہوس بن کر حسن پرستی شعار نہیں کی بلکہ جھوٹے عاشق" یا فرضی عاشق ہوتے ہوئے بھی معنوی عشق کا نمونہ پیش کیا۔ شعر کے لئے سوز و گداز ان کا مطمح نظر تھا چنانچہ "شعر کی طرف خطاب" میں فرماتے ہیں۔ ع

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

اور یہی نظریہ تھا جس کی بناء پر جہاں کہیں بھی شعر کی دلفریبی شعر کے سوز و گداز کے درمیان حائل ہونے لگی۔ حالی نے سوز کی خاطر دلفریبی کو خیرباد کہہ دیا۔ اگرچہ ان کے کلام کا بڑا حصہ سوز و گداز اور دلفریبی کا مجموعہ ہے لیکن جہاں کہیں بھی دلفریبی سوز و گداز کا ساتھ دینے سے عاجز نظر آئی حالی وہاں سے دلفریبی سے دست بردار ہو گئے

حسبِ ذیل اشعار اس بات کا بہترین ثبوت ہیں ع

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم پُرنم، اپنا تھا یا پرایا
دنیا سے اٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق
یہ کہہ کے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اسکو بھی رلایا

ان کا یہ سوز ان کی قدیم غزلیات میں بھی نمایاں ہے ع

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تونے کہا ہوتا
ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

محترمہ صالحہ عابد حسین نے "یادگارِ حالی" میں حالی کی شاعری کی بڑی جامع تعریف کی ہے فرماتی ہیں

"میر سے دردِ دل لیا، درد سے تصوف کی چاشنی، غالب سے حسن تخیل، ندرتِ فکر اور شوخ گفتاری سیکھی، سعدی سے بیان کی سادگی و معنی آفرینی اور شیفتہ سے سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے کا فن، وہ جذبات و احساسات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ ان میں دل کی سچی لگن اور اس کی دھڑکن صاف

سنائی دیتی ہے:

مندرجہ بالا تمام خصوصیات ان کے کلام میں قدم قدم پر ملتی ہیں مثلاً:

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

آیا نہ ہوگا اس کو تغافل میں کچھ مزا
ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

ہوگیا ذکرِ قیامت تو اجیرن واعظ
باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیانہ میں

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

حالی جب بقول خود انھیں کے اپنے نامۂ اعمال کو اچھی طرح سیاہ کر چکے اور کولھو کے بیل کی طرح دو گز زمیں پر چکر لگاتے لگاتے عاجز آگئے تو "شکستہ ناؤ کے ناخدا" سرسید احمد خاں نے ان کو دوڑنے کے لئے ایک لق و دق میدان دکھایا۔ یہی وہ وقت تھا جب قوم کا درد سینے کی پسلیوں کو توڑتا ہوا ان کے دل میں مکمل طور سے سما گیا اور سرسید احمد خاں کی تحریک پر انھوں نے اسلام اور قوم کے مدوجزر کی داستان دھیمے اور پُرسوز انداز میں چھیڑ دی جس کی مدہم آواز بڑھتے بڑھتے پکار کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ "مسدس" میں انھوں نے قوم کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ اور اس کے اسلاف کی شان و شوکت کا قصیدہ بھی۔ اس میں انھوں نے قوم کی موجودہ پستی اور تنزل کا پردہ چاک کیا ہے اور ماضی کی عظمتوں سے روتے ہوئے یوں

نقاب اٹھائی ہے جیسے کوئی لاش کے چہرے پر سے کفن سرکا کر اس کے اعزا کو اس کا آخری دیدار دیتا ہے۔ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے حالی کا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے اور ان کے قلم سے فخر و افتخار کے سوتے اُبل پڑے ہیں۔

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا　　فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یونان بنایا　　مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانہ کو خواب گراں سے

ہر اک میکدہ سے بھرا جاکے ساغر　　ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر　　گرہ میں لیا باندھ حکم پیمبر

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

لیکن جب قوم کی موجودہ تنزلی اور پستی کا ذکر کرتے ہیں تو خونِ جگر سیاہی بن کر قلم سے ٹپکتے معلوم ہوتا ہے۔ ع

نہ گالی سے نہ دشنام سے جی چرائیں　　نہ جوتی سے بیزار سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو نچھن دکھائیں　　جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اٹھائیں

لرزتے ہیں اوباش انکی ہنسی سے
گریزاں ہیں رند انکی ہمسائیگی سے

سکتہ کے مریض کو سب ہی مردہ سمجھتے ہیں لیکن طبیب کی

رائے ان سب سے مختلف ہوتی ہے۔ حالی بھی ایک طبیب تھے۔ سوتی ہوئی قوم کو انھوں نے مردہ نہیں تصور کیا، امید کا دیا ان کے دل میں ٹمٹما رہا تھا۔ لہذا مسدس کو انھوں نے قوم کا مرثیہ اور قصیدہ ہی بنا کر نہیں چھوڑا بلکہ اس سے نسخہ کا بھی کام لیا یہ ایسا نسخہ تھا جس میں قوم کے مرض دیرینہ کا علاج تھا۔ ع

بس اب علم و فن کے پھیلاؤ ساماں کہ ملتیں تمہاری نہیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیٔ دین ملت کو تھامے

دوسروں کی مثال دے کر حالی اپنی قوم میں بھی وہی خصوصیات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ع

ترقی کے یونان کے اسباب کیا تھے ہنر پر جہاں پیر و برنا فدا تھے
تمدن کے میداں میں زور آزما تھے وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے
مقاصد بڑے اور ارادے تھے عالی
نہ تھا اس سے چھوٹا بڑا کوئی خالی

اور اس ترقی کی وجہ کیا تھی یہ بھی حالی ہی کی زبان سے سنیئے ع

سبب کچھ نہ تھا اس کا جز قدر دانی کہ ہوتے تھے جو علم و حکمت کے بانی
ترقی میں کرتے تھے جو جانفشانی حیات انکو ملتی تھی داں جاودانی
وطن جلنے جی اپنے قرباں تھا سارا
پس از مرگ پجتے تھے وہ آشکارا

حالی نے صرف دعا ہی پر اکتفا نہیں کی۔ ذرا تصور کی آنکھوں سے دیکھئے مخلص و دردمند طبیب بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں بھی مانگ رہا ہے۔ ع

طفیل اسکا اور اسکی عترت کا یا رب — پکڑ ہاتھ جلد اسکی امت کا یا رب

اک ابر اس پہ کھیج اپنی رحمت کا یا رب — غبار اس سے جو دھوئے ذلت کا یا رب

کہ امت کو ہے ننگ ہستی سے اس کی
ہوا پست اسلام پستی سے اس کی

مسدس کے واقعات بظاہر ایک دوسرے سے الگ ہیں ان میں کہیں ابتدی کا ذکر ہے اور کہیں پستی کا، کہیں عروج ہے کہیں زوال کہیں شوکت و عظمت ہے اور کہیں نکبت و عسرت۔ لیکن مسدس کے ہر واقعہ میں ایک دوسرے سے ربط باہمی پایا جاتا ہے فرش کے ذرہ اور عرش کے مہر عالمتاب میں جو ہم آہنگی ہے اور جس کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اسی ہم آہنگی کا جلوہ مسدس کے واقعات میں بھی ملتا ہے ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

اس کے علاوہ "مسدس" کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم ہے کہ پورے چودہ سو برس کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی، اخلاقی ملکی اور قومی حالات کے عروج و زوال کی مکمل داستان ایک ایسی

نظم میں پیش کر دی گئی ہے جس کے اشعار کی تعداد بھی چودہ سو تک نہیں پہنچتی۔ اشرف علی خاں ایم اے مولف جدید تاریخ ادب اردو نے سچ کہا ہے۔

"مسدس انسانی تحقیق سے زیادہ الہامی کارنامہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ یہ تاریخ، مذہب، تمدن، سیاست اور ادب و شاعری کا ایک ایسا مکمل اور جامع شاہکار ہے جس کے ایجاز و اختصار، جامعیت و افادیت، حقیقت و واقفیت، آمد و حقیقت اور کیف و نشتر کی کماحقہ تعریف کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔"

یہ ہے مسدس کی اہمیت اور اس کی افادیت کا ایک ہلکا سا نقشہ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حالی کا سارا کارنامہ مسدس ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کے معجز رقم قلم کا اعجاز "مناجات بیوہ" "چپ کی داد" "حب وطن" "برکھارت" "مناظرہ رحم و انصاف" قطعہ، مثنوی اور قصیدہ میں بھی نمایاں ہے جن پر ایک معمولی سے مضمون میں روشنی ڈالنا سمندر کو کوزہ میں بھرنا ہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام سے حالی کا قلم کامیابی سے گزرتا چلا گیا ہے۔ فطرتِ انسانی کا بیان ہو یا مناظر قدرت کی تصویر، جذبات کی ترجمانی ہو یا احساسات کا بیان۔ حالی ہر کیفیت کا بیان نہایت کامیابی کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ جملہ خصوصیات

ان کے تمام کلام میں ملتی ہیں لیکن "مناجات بیوہ" کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا ہے یہاں حالی کی شان ہی نرالی ہے۔ "مناجات بیوہ" ان کا دوسرا شاہکار ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی جن کے سینے میں ایک مرد کا دل ہے کیسے اور کس طرح ایک بیوہ کے خیالات و جذبات اس خوبی سے پیش کر سکے جس کو خود صنف نازک بھی محسوس نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ بیوگی کا غم اٹھائے ہوئے نہ ہو۔

مصیبت اور پریشانی کے عالم میں انسان جب سب طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو خدا ہی کی طرف رجوع ہوتا ہے وہ کبھی اس کی تعریف کرتا ہے کبھی اس سے اپنی دکھوں کا حال سناتا ہے، کبھی شکوہ کرتا ہے اور کبھی دعا مانگتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح سے حالی انسان کی اس طرف سے بخوبی واقف ہیں "مناجات بیوہ" میں دنیا کی ٹھکرائی بے بس و بے کس بیوہ کی یہی کیفیت دکھائی گئی ہے۔ ذرا اس کو پڑھئے اور دیکھئے کیا ایک بیوہ کے جذبات و احساسات اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں جن کو حالی نے پیش کیا ہے۔ ع

اے میرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیری بھکاری
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں — دنیا سے بیزار چلی ہوں

دل پر میرے داغ ہیں جتنے منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
آٹھوں پہر کا ہے یہ جلاپا کانٹوں کی کس طرح رنڈاپا
تھک گئی میں دکھ سہتے سہتے تھم گئے آنسو بہتے بہتے

جس وقت کسی کا بن جانے کی خواہش بھی دل میں نہ تھی اس وقت پیتم ملا۔ لیکن جب کسی کا بن جائے اور کسی کو اپنا لینے کی تمنّا نے دل میں کروٹ لی اور پیت نے دھیرے دھیرے اپنا سکہ جمایا اس وقت پیتم ہی چل بسا اپنے خدا سے اس بات کا شکوہ کتنے پر درد انداز سے کیا ہے۔ ع

سیلانی جب باغ میں آئے پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم جب ہوئی پیت گنوایا پیتم
ہوش سے پہلے ہوئی میں بیوہ کب پہونچے گا پار یہ کھیوا

اس بچپن کے رنڈاپے میں اس کو کیسے کیسے دکھ اٹھانا پڑے اور کیسی کیسی مشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔ اس کا حال خدا سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ ع

تجھ پہ ہے روشن اے مرے مولا وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
تھاہ تھی پانی کی نہ کنارا تیرے سوا کچھ تھا نہ سہارا
شرم ادھر دنیا کی مجھے تھی فکر ادھر عقبیٰ کی مجھے تھی
طے کرنے تھے سات سمندر حکم تھا ہاں پاؤں نہ ہو تر

گو میلا چاروں کھونٹ تھا پھیلا — فکر یہ تھا پلّہ نہ ہو میلا
نفس سے ڈر تھا مجھ کو بدی کا — اس لیئے ہر دم تھی یہ تمنا
مر جاؤں یا زندہ رہوں میں — تجھ سے مگر شرمندہ نہ ہوں میں

بُرائی سے ہر چیز کو باز رکھا آنکھ، ہاتھ، پیر غرضیکہ ہر ایک کو روک تھام کے رکھا لیکن دل پر بس نہ چلا۔ اس میں مختلف قسم کی آرزوئیں پیدا ہی ہوتی رہیں۔ ارمان مچلتے رہے تمنائیں کروٹیں لیتی رہیں، اس کمزوری کا اعتراف صدقِ دل کے ساتھ ہے ع

ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا — تھا بیتاب جو اندر والا

لیکن ساتھ ساتھ اس بات پر بھی ناز ہے۔ ع

توڑے گر اس بات کا دانا — میں نے کہنا دل کا نہ مانا

ساری زندگی کی اس جانگداز اور صبر آزما کش مکش نے بیوہ کے دل کو دنیا کی خوشی و غم سے بے نیاز کر دیا۔ اور اس کشمکش حیات نے اس کی آنکھوں پر اس حقیقت کو آشکارا کر دیا۔ ع

آنی جانی جیسے ندیا خوشیاں — چلتے پھرتے چھاؤں ہیں ارماں
ہیں دو دن کے سب میلا رے — آخر چل کر ہیں چھپت وے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگر کی ریت یہی ہے
ساتھی سنگ اور سوگ یہاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یہاں کا

ساری مناجات پڑھ جائیے کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا

لکھنے والا کوئی مرد ہے۔ مناجات کی زبان، اس کے خیالات، اس کا انداز غمازی کرتا ہے کہ اس کی لکھنے والی ایک "بیوہ شاعرہ" ہے جو اپنے مالک کو اپنی بپتا سنا رہی ہے۔ اردو کا کوئی شاعر عورت کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے جذبات و احساسات کے ایسے انمول موتی نہیں لا پایا۔ جیسے حالی نے "مناجات بیوہ" میں پیش کئے ہیں۔

حالی کا یہ سارا کارنامہ اور ان کی واحد شخصیت کی یہ ساری کثرت صرف نظم ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کی شعاعوں نے ادب کے دوسرے حصے یعنی نثر کو بھی تابانی بخشی ہے۔ انھوں نے اردو نثر کو صرف سوانح نگاری اور تنقید ہی سے روشناس نہیں کرایا بلکہ پورے ادب میں زندگی کی تڑپ اور مستقبل میں آگے بڑھنے کی قوت بخشی۔ انھوں نے اردو نثر کو اپنی سادگی اور متانت سے وہ طاقت عطا فرمائی جس سے اس نے ان امراض پر فتح حاصل کی جو اندر ہی اندر ادب کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے تھے انھوں نے نثر کو ایک ٹھوس، سادہ، عالمانہ اور سنجیدہ اسلوب بخشا جو مستقبل کے ادیبوں کے لئے مشعل راہ بنا حالی کے نثری کارنامے حسب ذیل ہیں۔

(۱) مذہبی :۔ تریاقِ مسموم۔ مولود شریف۔ مجالس النساء

(۲) تنقیدی :۔ یادگارِ غالب۔ مقدمہ شعر و شاعری

(۳) سوانحِ عمری :۔ حیاتِ سعدی۔ حیاتِ جاوید۔ یادگارِ غالب

(۴) مختلف مضامین :۔ مقالاتِ حالی۔ تقاریظ اور تبصرے۔

(۵) مکاتیب۔

یہ صحیح ہے کہ ان پانچوں حیثیتوں سے حالی کا سکہ دل پر نہیں بیٹھتا کیونکہ تاریخ ادب اردو حالی سے پہلے دوسرے کامیاب مقالہ نگار، مکتوب نگار اور مذہبی مصنفین کے نام پیش کر سکتی ہے جنھوں نے حالی سے بہتر مقالات مکاتیب اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں لیکن جب تنقید اور سوانح نگاری کا سوال آتا ہے تاریخ ادبیات ہمیں کسی مستقل نقاد یا سوانح نگار کا نام پیش کرنے سے قاصر ہے اور اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علامہ شبلی حالی سے بہتر سوانح نگار تھے اور سرسید نے حالی کے مقابلے میں شبلی کی تحریر کو سمجھنے کے لیے زیادہ موزوں سمجھا تھا لیکن اس سے حالی کی عظمت میں فرق نہیں آتا کیونکہ شبلی کی یہ ساری کامیابی حالی کی رہین منت ہے اور یہی وجہ ہے کہ حالی کا مرتبہ تنقید و سوانح نگاری میں سب سے بلند ہے وہ ان دونوں فنوں کے مجدد ہیں۔ اگر حالی نے تنقید اور سوانح نگاری کی مضبوط بنیاد قائم نہ کر دی ہوتی تو آج شبلی، عبدالرحمن بجنوری، کلیم الدین احمد، سلام سندیلوی، شیخ اکرام، ڈاکٹر زور، عبدالماجد دریابادی، آل احمد سرور، عبدالشکور، رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، وغیرہ تنقید اور سوانح نگاری کی اتنی مضبوط صورت نہیں پا سکتے تھے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حالی کی رکھی ہوئی بنیاد میں نقص نہیں تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نقص اتنا زیادہ تھا کہ اس کو آنے والے معمار ٹھیک نہیں کر سکتے تھے اور جس کی بنا پر

ساری عمارت ہی کمزور ہو جاتی۔ حالی نے بنیاد کی اینٹ ٹیڑھی نہیں لگائی جس کی وجہ سے ساری عمارت ہی ٹیڑھی ہو جاتی۔ ہاں بہ تقاضائے بشریت ان سے اتنی غلطی ضرور ہو گئی کہ کہیں کہیں مصالحہ ٹھیک نہیں لگا پائے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مشہور کتابوں "یادگار غالب اور" مقدمہ شعر و شاعری" میں جستہ جستہ خامیاں رہ گئی ہیں مثلاً یادگار غالب میں غالب کی زندگی کے بہت سے حالات تشنہ چھوڑ دئے ہیں اور غالب کے بعض عیوب پر خوبصورتی سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اسی طرح سے مقدمہ شعر و شاعری میں اردو شاعری پر یک طرفہ بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے عیوب پر سے پردہ اٹھایا ہے لیکن اس کے محاسن کو اجاگر نہیں کیا جس کی وجہ سے اردو شاعری کی طرف سے ایک عام غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کا سدباب کرنے کے لئے جناب مسعود حسن کو "ہماری شاعری" لکھنا پڑی۔ لیکن اگر کوئی ناقد وسیع النظری سے کام لے تو ان کی فرد گزاشتیں یہ کہہ کر بڑی آسانی سے معاف کر سکتا ہے کہ کوئی بھی شخص کسی کام کو ابتدائی منزل سے لیکر ترقی کی آخری حد تک نہیں پہنچا سکتا۔ علم و فن کے عروج کے لئے مختلف زمانوں، مختلف حالات اور ان گنت دماغوں کی ضرورت ہوتی ہے ہر علم و فن تبدریج ہی ترقی کر سکتا ہے لہذا اس کے موجد پر ہم ہرگز یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ اس نے یہ کیا، اور وہ کیوں نہیں کیا؟ اگر ہم آج جارج اسٹیفنسن کے اس عظیم احسان سے جو اس نے انجن بنا کر ہم پر کیا۔ یہ کہکر انکار کر دیں کہ اس کا

انجن اتنا بھیانک اور ہیبت ناک شکل کا تھا کہ عوام اس کو شیطان کی سواری خیال کرتے تھے تو یہ ہماری سخت حماقت اور ناشکرگذاری ہوگی۔ جارج اسٹیفنسن نے جو کچھ کیا اس کے لئے ہم شکرگذار ہوسکتے ہیں اور اس کی تعریف کرسکتے ہیں لیکن جو کچھ اس سے نہ ہوسکا اور جس کو دوسروں نے انجام دیا اس کے لئے ہم اس کی مذمت نہیں کرسکتے ۔ اس نے اپنے زمانہ میں اور اپنی عقل کے بموجب جو کچھ کیا درست کیا۔ اسی طرح سے حالی نے اپنے سماج اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جتنی بھی تنقید کی بہت کی۔ اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو حالی کی یہ فرد گذاشت کہ انھوں نے غالب کی مے نوشی کا ذکر ان کی عقیدت و محبت میں سرسری طور سے کیا ہے۔ عبدالرحمن بجنوری کی اس عقیدت بے جا کے آگے بالکل ہیچ ہے جس کے ہاتھوں مجبور ہوکر بجنوری نے غالب کی شراب کو شراب طہور اور غالب کے کلام کو الہامی کتاب کہہ دیا۔

حالی کی تنقیدوں میں اعتدال اچھے اچھے نقادوں سے زیادہ ہے اور ہم یہ بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ انکی سوانح عمریاں منقبت کا نمونہ ہیں۔ مداحی کا الزام سب سے زیادہ انکی "حیات جاوید" پر لگا لیکن اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اکثر مقامات پر حالی نے سرسید پر سخت تنقید کی ہے ان کے معتقدات سے سختی کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور ان کی کمزوریوں کا بھی اظہار کیا ہے ان کی تفسیر قرآن کے بارہ میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں " جا بجا سنگین غلطیاں بھی کی ہیں

اور انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ حالی نے سرسید کی تعریف جہاں دل کھول کر کی ہے وہاں ان کو "ضدی" کا خطاب دیتے ہوئے بھی ہچکچائے نہیں۔ حیات جاوید ایک مکمل سوانح عمری ہے اس میں سرسید کی زندگی کے دونوں رخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں سرسید کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ بہت صاف ہے اور آج تک اتنی صاف تصویر کوئی دوسرا نہیں بنا سکا ہے۔ اس سوانح عمری کی قدر و قیمت کا اندازہ شبلی کے اس بیان سے نکلتا ہے۔

"ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی داستان حیات لکھی ہے اور ثنا سائے فن ہو کر لکھی ہے" حیات جاوید کی اہمیت اور اس کی قیمت مسلم ہے۔ سرسید کو سمجھنے میں یہ رہنما ثابت ہوتی ہے لیکن ہم اتنا کہنے کی جرأت ضرور کریں گے کہ یہ اتنا کچھ مواد ہم کو نہیں دیتی جس کا دعویٰ حالی نے کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"سید احمد کا سونا کسوٹی پر کسا جائے گا اور اس کا کھرا کھوٹا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے گا۔ اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جائے گا"

کاش حالی دیباچہ میں اتنا بڑا دعویٰ کرکے پڑھنے والے کی توقعات کو اتنا بڑھا دیتے جو آخر میں پوری نہیں ہوتیں۔ جب حالی کا دعویٰ پیش نظر رکھ کر کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کے ختم ہوتے ہوتے

خطوط اور مقالات میں بھی حالی کے قلم نے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ غالب کے خطوط کے بعد ادب میں حالی کے خطوط اپنی سادگی، صداقت خلوص کے اعتبار سے ممتاز ہیں عبارت سے کہیں تصنع ظاہر نہیں ہوتا۔ غالب کے خطوط سادگی کا بہترین مرقع ہیں لیکن ان کی سادگی کی نقاب سے کہیں کہیں آورد کا چہرہ جھلکتا نظر آتا ہے لیکن برخلاف اس کے حالی کے خطوط میں آمد ہی آمد ہے ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے جائیے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہاں قصداً سادہ نگاری کی کوشش کی گئی ہے۔

حالی کے مقالات بھی بڑے پائے کے ہیں۔ اس میں انھوں نے ہر قسم کے سیاسی، سماجی، اصلاحی، تاریخی اور مذہبی معاملات نہایت کامیابی کے ساتھ ان کے مناسب اسالیب میں ادا کئے ہیں ان کے مقالات پڑھ کر ہی مہدی حسن کے اس جملے کی صداقت کا اندازہ ہوتا ہے

"سر سید کے بعد اگر کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں۔ اسلوب میں وہ سر سید کے بہترین مقلد ہیں مختلف مضامین کو ان کے مناسب اسلوب میں ادا کرنے کا گر انھوں نے سر سید ہی سے سیکھا تھا۔ بعض وقت ان کی عبارت پر سر سید کی عبارت کا دھوکا ہوتا ہے۔ زبان گویا سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں

"اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی! اور میرے

توقعات پر ایک ٹھیس لگتی ہے اور بے اختیار خود انہیں کا ایک مصرع یاد آجاتا ہے۔ ع

"یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجئے گا"

"یادگارِ غالب" حالی کا ایک اور بڑا نثری کارنامہ ہے۔ یہ کتاب مرزا غالب کی سوانح حیات اور ان کے کلام کی تنقید و تشریح پر مشتمل ہو حالی شاعر یا ادیب کے حالات زندگی پر زیادہ توجہ نہیں دیتے انھوں نے اپنی تینوں سوانح عمریوں "حیاتِ جاوید" "حیاتِ سعدی" اور "یادگارِ غالب" میں ہیرو کے حالات زندگی پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی ان کے کارناموں پر۔ یادگارِ غالب میں بھی انھوں نے غالب کے حالاتِ زندگی کے لئے کتاب کا ایک چوتھائی حصہ وقف کیا اور تین چوتھائی حصوں میں ان کے کلام کے حسن و قبیح کو پرکھا ہے۔ ان کے مشکل اشعار کا مطلب نہایت آسان اور دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے اور ان کے کلام کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر ادب میں اس کا درجہ متعین کیا ہے۔ آل احمد سرور نے بالکل صحیح لکھا ہے اور غالب کے سر پر جو شہرت کا تاج رکھا ہے اس کو چمکانے میں حالی کا بڑا ہاتھ ہے۔" یادگار میں گو غالب کی خصوصیت کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن اس میں منقبت کا پہلو نہیں پیدا ہونے دیا گیا۔ حالی کے منکرین یہاں تک کہ اکرام صاحب بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے" یادگارِ غالب حالی کی منصفانہ تنقید کی بہترین مثال ہے۔" یادگار" نہ صرف غالب کی خصوصیات کی یادگار ہے بلکہ یہ حالی کی بے لاگ تنقید کی بھی یادگار ہے۔

بگڑے کام کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا
روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں
سے سیکھا اور کس سے سیکھا کہیں تو شہد ہے کہیں حنظل کہیں
تو زہر ہے اور کہیں تریاق:

دیکھئے اس عبارت کا رنگ سر سید کے مضمون "امید کی خوشی" کی عبارت
سے کس قدر ملتا ہے۔

"اے نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی
یہ خدائی روشنی تیرے ساتھ ہے تو ہی ہماری مصیبت کے
وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں
میں ہماری مدد کرتی ہے تیری ہی بدولت نہایت دور دراز
خوشیاں ہم کو نہایت قریب نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے
سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔"

غرضکہ حالی ہی وہ تنہا شخص ہیں جو نثر و نظم دونوں میں اعلیٰ
مقام پر ملتے ہیں "مسدس" ہو یا "شکوۂ ہند" "مناجات بیوہ" ہو یا
"چپ کی داد" "مقدمہ شعر و شاعری" ہو یا "یادگار غالب" "حیات
جاوید" ہو یا "حیات سعدی" حالی بڑی متانت اور سنجیدگی کے
ساتھ اپنی بھرپور شخصیت کو اس میں جھلکا کر اس کو ادب کا گراں مایہ
سرمایہ بنا دیتے ہیں۔ ان کی نثر و نظم پر نظر ڈالنے کے بعد ہم
یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شبلی بھی ہیں اور سر سید بھی۔ ان کے

سینے میں غالبؔ، میرؔ اور شیخ سعدیؔ کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کی آنکھ میں ذکاء اللہ اور مولوی چراغ علی کی بصارت ہے اور ان کے ہاتھ ہاتھ میں نذیر احمد و آزاد کا قلم ہے اور اسی لئے وہ "مجدد ادب اور" سعدی ہند" کہلائے۔

نادم سیتاپوری

جہان آباد میں حالی

اگر میر و غالب آگرہ میں پیدا ہونے کے باوجود "دہلوی" کہے جا سکتے ہیں، ولی محمد نظیر عظیم آباد (بہار) میں جنم پاکر "اکبرآبادی" کہلانے کے مستحق ہیں اور میر انیس فیض آباد کی سرزمین سے ابھر کر لکھنوی ہو سکتے ہیں تو حالی کے "دہلوی" ہونے میں کلام کی گنجائش ہی کیا ہے؟ بقول مولوی سید محمد فاروق مرحوم دہلی حالی کا بھی ویسا ہی دلی اور معنوی وطن تھا جیسا میر و غالب کا۔

"ان واقعات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ (حالی) کی زندگی کا بہترین حصہ دہلی میں بسر ہوا ہے اور اگر میر و غالب اپنے طویل قیام دہلی کے لحاظ سے "دہلوی" — اور ناسخ و آتش اسی اعتبار سے لکھنوی کہلائے جانے کے مستحق ہیں تو مولانا حالی نے کیا قصور کیا ہے کہ انھیں دہلوی کہنا تو ایک طرف

رہا ان کی زبان آج تک ہدف ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہو"
(صفحہ ۱۱ حیات حالی مطبوعہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور)

حقیقت یہی ہے اگرچہ حالی نے کبھی اپنے دہلوی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ان کے ایسے "منکسر المزاج" انسان سے ایسی توقع کرنا چاہیے۔ ان کی خاکساری اور انکساری کا تو یہ عالم تھا کہ تمام زندگی اپنی کسی گرانقدر سے گرانقدر تصنیف کا اپنے آپ کو "مصنف" ہی نہیں کہا۔ ہمیشہ اپنی "مرتبہ لکھوایا۔ یا زیادہ سے زیادہ مولفہ۔

حالی جنھوں نے اردو شعر و ادب کو محض جدید تنقید نگاری اور سوانح و سیرت کو صرف نئی قدروں ہی سے ہی روشناس نہیں کرایا۔ بلکہ اردو شاعری کو "قومی شاعری" اور جدید شاعری کی نئی روشنی بھی بخشی۔ اپنی ۷۷، ۷۸ سال کی تمام زندگی میں مستقل طور پر پندرہ سولہ سال سے زیادہ دہلی میں نہ رہ سکے۔ لیکن پانی پت اور دہلی کے درمیان باون، ترپن میل کا فاصلہ ہی کیا تھا ان کے لئے دہلی ہمیشہ گھر آنگن رہا۔ جب چاہا دہلی سے پانی پت پہونچ گئے اور جب دہلی کی یاد نے ستایا پانی پت سے دہلی آ گئے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں

"میں کچھ اوپر تیس برس سے شہر دہلی میں آمد و رفت رکھتا ہوں اور کم سے کم پندرہ سولہ برس اسی شہر دہلی میں میرا قیام رہا۔"
(مقالات حالی حصہ اول۔ مضمون ۳۱)

اور اس پندرہ سولہ برس مستقل قیام کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۵۴ء - ۱۸۵۵ء

"اس وقت (۱۸۵۴ء) میری عمر سترہ برس کی تھی اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دہلی چلا گیا اور تقریباً ڈیڑھ برس کے (یعنی ۱۸۵۵ء تک) رہ کر کچھ صرف نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے پڑھیں میں نے دلی میں شرح مسلم ملاحسن، میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چاروناچار مجھکو دلی چھوڑنا اور پانی پت آنا پڑا۔"

یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔

(ترجمان حالی بحوالہ حالی کا ذہنی ارتقاء صفحہ ۹۰ مطبوعہ اردو پریس کراچی)

۱۸۷۴ء - ۱۸۸۹ء

"اس کے بعد (یعنی ۱۸۷۴ء) والے چار مناظموں کے بعد لاہور سے دہلی کی مدرسی پر بدل آیا۔"

(صفحہ ۴۲ - حالی کا ذہنی ارتقاء)

"اسی سال (جنوری ۱۸۸۷ء) مولانا حالی دہلی کے اینگلو عربک اسکول سے بدل کر ایچیسن (چیفس) کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلباء کے اتالیق مقرر ہوئے لیکن وہاں آٹھ مہینے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ جون ۱۸۸۷ء

۲ میں اپنی جگہ پر (دہلی) واپس آگئے۔"
(صفحہ ۱۰۱۔ حالی کا ذہنی ارتقاء)

۳ "اب وہ پچھلی ملازمت (انیگلو عربک اسکول دہلی) سے استعفیٰ دے رہے تھے اور اس کی درخواست کا مسودہ پیارے لال (آشوب) کو درست کرنے کی خاطر بھیجا تھا لیکن جولائی ۱۸۸۹ء میں انھوں نے بجائے استعفیٰ دینے کے ایک سال کی رخصت بلا تنخواہ طلب کی تھی۔ ۱۳؍ اگست ۱۸۸۹ء کو مولانا حالی دہلی سے پانی پت چلے گئے۔"
(صفحہ ۱۱۷ حالی کا ذہنی ارتقاء)

سولہ برس کی یہ مدت تو دہلی کے مستقل قیام کی ہے جو زیادہ تر سلسلہ ملازمت مستقل طور پر دہلی میں گزری ورنہ قریب قریب آدھی عمر اسی دہلی کے گرد وپیش بتا دی۔ عنفوان شباب میں ڈیڑھ دو برس کا جو مختصر سا زمانہ حالی نے دہلی میں گذارا تھا وہ دہلی کی آخری سانسیں تھیں۔ ایک طرف تو شاہجہاں آباد کے "میکدۂ علم وادب" میں جام وسبو کی جھنکار سے کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ دوسری طرف "قلعہ معلیٰ" کی الف لیلائی راتیں سازشوں اور غلط کاریوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں منجمد نظر آرہی تھیں۔ حالی کے ذہن وشعور نے تصویر کے دونوں رخ محسوسات کی نگاہوں سے دیکھے۔ اچھائی کو اچھائی کی نگاہ سے۔ برائی کو برائی کی نظر سے۔ یہاں تک کہ ان کے تحت الشعور نے نقد وتبصرہ کی ایک متوازن طاقت حاصل کرنے

میں کامیابی حاصل کرلی جس نے پہلے تو انھیں ایشیائی غزل کے اس قدیم رنگ سے بہت کچھ علیحدہ کر دیا جس میں مبالغہ زیادہ اور واقفیت کم تھی اس کے بعد انھیں "تنقید نگاری" کے ان نفسیاتی اور بنیادی اصولوں سے الہامی طور پر روشناس کرایا جنھیں آج اردو شعر و ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس وقت کی یہی دہلی ـــ حالی کا سب سے بڑا ادبی وطن تھا جہاں انھوں نے ہوش کی آنکھیں کھولکر وہ سب کچھ پالیا تھا جس سے ایک ستھرے ذہن و دماغ کی تربیت و نشو نما ہوسکتی تھی اور پھر ایک تربیت یافتہ عروج و ارتقاء کی اسی منزل تک پہونچ سکتا تھا۔ جہاں ایک دن حالی پہونچ گئے تھے۔ شجاعت علی سندیلوی کے یہ الفاظ اسی حقیقت کی منہ بولتی عکاسی ہیں:

> "سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں حالی اپنا وطن پانی پت چھوڑکر تحصیلِ علم کے شوق میں دلی چلے آئے تھے یہاں اس وقت بڑے بڑے بزرگ عالم موجود تھے جن سے حالی نے کسب فیض کیا دلی میں اس وقت شعر و شاعری کا بھی بڑا چرچا تھا جو حالی کے فارسی اور عربی کے استاد شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اس کا اثر حالی کی طبیعت پر پڑنا لازمی تھا۔ اس زمانہ میں ذوق، مومن اور غالب جیسے باکمال شاعر دلی میں موجود تھے اور یہاں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا حالی ان

محفلوں میں اکثر شرکت کرتے اور ان باکمال شاعروں کو خود ان کی زبان سے سنا کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں حالی کے دلمیں جبکہ طبیعت میں اس کا فطری مادہ موجود ہی تھا۔ شعر کی لگن پیدا ہونی ناگزیر تھی ان کا شعر کہنے اور سمجھنے کا شوق تیز ہو گیا۔"

(صفحہ ۸۰ مطالعہ حالی مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)

اور حالی کے اسی ابتدائی احوال کا ذکر کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے ــــ

"اسی زمانہ میں علم و ادب کی شمع دلی میں بجھنے سے پہلے بھڑک اٹھی تھی۔ علاوہ اور علوم و فنون کے شاعری بھی فروغ پر تھی۔ الطاف حسین (حالی) کو بھی اکثر مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اور فطرت نے جو خداداد جوہر ان کو ودیعت کیا تھا وہ ابھرنے لگا۔"

(صفحہ ۲۷ یادگار حالی مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند))

ان دو اقتباسات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ حالی نے شعور کی آنکھ اس وقت کی دہلی میں کھولی تھی جب دہلی غالب، ذوق، مومن اور صہبائی جیسے باکمال ارباب علم و فضل کی دلی کہی جاتی تھی اور اس مختصر زمانے قیام میں حالی نے وہ سب حاصل کر لیا تھا جس کے لئے اس زمانے میں برسوں خاک چھاننا پڑتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی

چھوڑنے کے بعد حالی کو تمام عمر کسی علمی درس گاہ کی ناصیہ فرسائی کی ضرورت نہیں پڑی اور اس دور کے ابتدائی نقوش ان کے ذہن و شعور پر کچھ اس طرح مرتسم ہو گئے کہ تقریباً چالیس سال کے بعد جب وہ غالب کی سوانح حیات (یادگار غالب) لکھنے بیٹھے تو اُجڑی ہوئی دلی کے تمام دھندلکے اپنے صحیح خد و خال میں ان کے سامنے تھے جن میں حالی اگر "حرفِ اوّلیں" کا درجہ نہ دے جاتے تو آج "غالب پرستوں" کا ذوقِ تحقیق جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا۔

حالی کی تریں تصانیف (۱۷ نثر میں اور ۲۶ نظم میں) اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اردو شعر و ادب کا ایک لازوال سرمایہ سمجھی جاتی ہیں لیکن ان میں ان غزلوں اور نظموں کے علاوہ جنھوں نے اردو کے ذوقِ شعری کو "جدید شاعری" کے اندازِ فکر سے روشناس کرایا ان کے علاوہ "مقدمہ شعر و شاعری" اردو زبان و ادب کی وہ پہلی تنقیدی کاوش ہے جس نے ایشیائی شاعری کے متزلزل راستوں میں ایک "معجزہ فرما" ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے۔ اور مشہور نقاد سید احتشام حسین کے یہ الفاظ یقیناً رسمی الفاظ نہیں ہیں کہ —

"ہماری شاعری دل والوں کی دنیا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اسے ایک ذہن دیا۔ بیسویں صدی کی تنقید حالی کی اسی ذہنی قیادت کے سہارے پر ابھی تک چل رہی ہے۔"

(صفحہ ۱۹۹ مطالعہ حالی)

احتشام حسین کے یہ الفاظ مہدی الافادی مرحوم کے اس بیان کی ایک ناقدانہ وضاحت کرتے ہیں جنھوں نے اس صدی کی دوسری اکائی میں حالی کی تنقیدی عظمت کا اس وقت تجزیہ کیا تھا جب اردو ادب تنقید کے نئے زاویوں سے بہت حد تک بے خبر تھا

"میرے ذہن میں حالی کی عظمت" دیوان حالی" کے اس حصہ سے ہے جس نے "مقدمہ شعر و شاعری" کے ذریعہ سے اسے ایک ذہن دیا۔ بیسویں صدی کی تنقید حالی کی سی ذہنی قیادت کے سہارے پر ابھی تک چل رہی ہے۔" (صفحہ ۱۹۶۔ مطالعہ حالی)

حالی کی اسی متوازن اور اصولی تنقید نگاری کا یہ کمال ہے کہ غالب کی اس ہمت افزائی کے بعد بھی۔

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"

(صفحہ ۷۵۔۷۶۔ تلامذہ غالب مطبوعات مرکز تصنیف و تالیف نکودر)

لیکن غالب سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے باوجود بھی حالی اس کا اعتراف نہ کر سکے کہ انھیں صحیح معنوں میں غالب سے استفادہ حاصل ہو سکا۔ فرماتے ہیں۔

"میرے وہاں جانے سے ان (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)

کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا اسی زمانے میں اردو و فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم (شیفتہ) کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا انھیں کے ساتھ میں اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم (شیفتہ) کی صحبت سے ہوا وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے۔

اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے

(صفحہ ۱۱، ۱۲ مطالعہ غالب)

حالی کی نگاہوں میں غالب کی جو شاعرانہ عظمت تھی اس اعتراف حقیقت سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ حالی یقیناً یہ سمجھتے تھے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت و شخصیت کے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے جس فضا اور ماحول کی ضرورت ہے وہ ابھی بن نہیں سکا ہے چنانچہ اسی زمین کو ہموار کرنے کیلئے انھیں فن تنقید نگاری کو اصول اور آئین کے ایک متوازن معیار میں منضبط

کرنا پڑا۔ پھر اس کے بعد انھوں نے اپنے استاد کے بارے میں "یادگار غالب" جیسی اہم تصنیف کو جنم دیا جو غالب کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جن میں تصوف بھی ہے، فلسفہ بھی ہے، مسائل حیات بھی ہے اور رندی و خرابائی بھی ہے!

ان پچاس سے زیادہ نثری تصانیف اور منظومات میں یوں تو حالی نے زبان، ادب اور تاریخ کے بیشمار انمول رتن قوم و وطن کے لیے چھوڑے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جو مقبولیت "حیات سعدی" مقدمہ شعر و شاعری، مسدس حالی (مد و جزر اسلام) یادگار غالب اور حیات جاوید کو حاصل ہوئی ہے وہ اساسی اور بنیادی طور پر ان چند مثنویات اور نظموں کے علاوہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو جو جدید شاعری کی نشان راہ سمجھی جاتی ہیں۔ اور ان تمام تصانیف و تخلیقات کے پس منظر میں بلاشبہ ان کے ادبی وطن دہلی کا سب سے بڑا ہاتھ رہا ہے جس کا ذکر جب ان کی زبان پر آیا ہے تو آنکھوں میں والہانہ اور غیر اختیاری طور پر آنسوؤں کا ایک اتھاہ سمندر ضرور امنڈ آیا ہے ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ ایک سسکتی ہوئی آہ بھی لبوں تک آ رہی ہے جس میں میر کی بچھڑی ہوئی دلی سے کچھ کم سوز و گداز نہیں ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ میر نے نادرشاہ درا اور احمد شاہ ابدالی کی تخت و تاراج کی ہوئی دلی کا ماتم کیا ہے اور حالی نے انقلاب سن ستاون میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹی دلی پر آنسو بہائے ہیں۔ میر نے اپنے اس معنوی وطن کی تباہی و بربادی کا ذکر رقت انگیز

طریقے پر کئی جگہ کیا ہے۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی۔ تصویر نظر آئی

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

ایک دوسری جگہ بچھڑے ہوئے احباب اور اعزہ کی جدائی پر نوحہ کناں ہیں۔

مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں
لوگ وے پل مارتے کیدھر گئے

تھے لبِ جُو پر جو گرم دید یار
سبزے کے سے رنگ مژگاں تر گئے

خانوادے ہوگئے کیا کیا خراب
خانہ ساز دین کیسے مر گئے

پھر جب ترک وطن کرکے لکھنؤ پہنچے تب بھی دلی کی وہی تڑپ دل میں نشتر زن تھی نازک مزاجی چشم و ابرو کے اشاروں کی متحمل نہ ہو سکی۔ بر سر مشاعرہ ایک درد انگیز چیخ منہ سے نکل ہی گئی۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

لیکن میر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھی اس اجڑے دیار کا دل نہ پسیجا۔ برباد سرشت دلی کی دلبرانہ ادائیں سرد ہی بھری کے

ترکش ہی خالی کرتی رہیں ۔ نیر کی خودداری کہاں تک صبر کرتی ؟ یہ بھی روٹھے اور ایسے کہ پھر کبھی مڑ کر دلی کی طرف نہیں دیکھا لکھنو ہی کی خاک کو خاک لحد بنایا آج بھی وہیں محو خواب ہیں ۔

میر کے بھی آنسو ایک دن حالی کی پلکوں پر بھی چھلک آئے ۔ دہلی کے لٹنے کا دلدوز منظر انھوں نے خود تو نہیں دیکھا تھا لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء میں بے گناہ محبان وطن کے خون کی چھینٹیں ابھی تک دلی کی در و دیوار پر موجود تھیں۔ بڑی بڑی حویلیاں اور عالیشان دیوان خانے زبان حال سے گریہ کناں تھے ۔ سیکڑوں ساتھی اور احباب انقلاب کے طوفان خیز دھاروں میں ہچکولے کھاتے تھے ۔ حالی بھی اس جگر خراش منظر کو نہ دیکھ سکے ۔ "دہلی مرحوم" انھیں دلی تاثرات کا ایک الم انگیز مرثیہ ہے ۔

تذکرۂ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے — ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں — نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دہلی — ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائیگا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنوں کے بعد
شعر کا نام نہ لیگا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

جس بلا کی درد انگیزی اور رقت خیزی ان اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ ایسی ہی سرزمین سے قدرتی و فطری وابستگی کا ثبوت ہے جسے وطن کہہ سکتے ہیں۔ اور "وطن" بھی ایسا وطن جسے چھوڑتے وقت زندگی کی تمام آرزوئیں موت کی یاس انگیز خواہشوں میں سمٹ آتی ہیں ایک دوسری جگہ کہا ہے۔

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

حالی جیسے متحمل مزاج اور صبر آزما انسان کے دل کی یہ پکار لاشعور کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک آواز تھی جس کے لفظ لفظ سے دلی کی والہانہ محبت ٹپک رہی ہے اور یقیناً کوئی حساس مزاج اپنے وطن کے قدموں پر اس سے زیادہ تاثرات کی دولت نچھاور نہیں کر سکتا جو حالی نے لٹائی ہے۔ ان تاثرات سے ہٹ کر جب ہم حالی کی ذہنی نشو و نما اور ارتقار کا تجزیہ کرتے ہیں تو "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" دو ایسی حالی کی دلی سے گہری وابستگی کا سب سے اہم دستاویزی ثبوت نظر آتی ہیں جن میں غالب اور سرسید جیسی منفرد شخصیتوں کی تعمیری زندگی کے

علاوہ دہلی کے "اوراقِ مصور" اس منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے
جسے شاید ہی کوئی "غیر دہلوی" الفاظ کا جامہ پہنا سکتا۔

حالی اور دہلی کے درمیان جو روحانی رشتہ قائم تھا میں اسے "مکان و زمان" کے تصور سے بھی بلند سمجھتا ہوں۔ سرسید "مسدس حالی" کو ایک الہامی تخلیق سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ روزِ حشر اگر مجھ سے پوچھا گیا کہ تم اس عالم آب و گل سے کیا لائے ہو۔ تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ "مسدس حالی"۔ سرسید جس تعمیری سیرت کے انسان تھے ان سے اسی جواب کی توقع کرنا چاہیے۔ لیکن میری نظر میں جو عظمت "یادگارِ غالب" کی ہے میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ شجاعت علی سندیلوی نے "یادگار غالب" کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے۔

"اس دور (انیسویں صدی کے آخری چند سال) کی سب سے آخری اور سب سے بہترین تصنیف اردو کے ایک بلند مرتبت شاعر کی مبسوط سوانح عمری ہے اس تصنیف میں مرزا غالب کی محض سوانح حیات ان کی نظم و نثر کی تصانیف کی مکمل فہرست تصنیف کی مکمل کیفیت۔ غالب کی اردو، فارسی نظم و نثر پر عالمانہ و بے لاگ تبصرہ۔ ان کے مشکل اشعار کی بے نظیر شرح ہے   آج اردو انگریزی میں غالب کی متعدد یادگاریں موجود ہیں لیکن پھر بھی "یادگار غالب" کی افضلیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ شبلی کے لیے

بے لاگ ناقد بھی اس کے سحر سے مسحور تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کا نفسیاتی تجزیہ جس طرح یادگار غالب میں موجود ہے بحیثیت مجموعی کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔"

(صفحہ ۷۶۔ ۷۷۔ مطالعہ حالی)

جس طرح اردو شعر و سخن سے 'غالب' کا نام نکال دینے پر یہ ہانڈی پھیکی رہ جائے گی اسی طرح اگر "مرحوم دہلی" کے ادب، فن کی فہرست سے غالب کا نام، اور پھر غالب کے ذکر سے 'یادگار غالب' جیسے لافانی شاہکار کو نظر انداز کر دیا جائے تو اردو شعر و ادب کی دنیا بہت حد تک تاریک ہو جائے گی جس میں سیرت و سوانح کی نئی قدروں کے علاوہ جدید تنقید نگاری بھی اپنے صحیح خدوخال میں نمایاں و درخشاں ہے

مسدس حالی (مدوجزر اسلام) اگرچہ تصویر کا ایک دوسرا رخ ہے لیکن یہ نقوش بھی حالی کے تاثرات پر دہلی کی تباہی کے بعد ہی ابھرے ہیں جس میں ازل سے آج تک ایک قومی زندگی انگڑائیاں لے رہی ہے اور محسوسات کی یہ منہ بولتی تصویر بھی اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حالی نے دہلی کی قومی تباہی و بربادی کو محسوسات کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی جو ان کا ادبی، روحانی اور معنوی وطن تھا۔

حالی کی شاعری

(ڈاکٹر) محمد حسن

حاؔلی کی شاعری

(ایک جائزہ)

حاؔلی سے ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے یوں تو اس دور کے لئے ۱۸۳۵ء ہی میں زمین ہموار کی جانے لگی تھی جب انگریزی کو عربی فارسی اور سنسکرت کے مقابلے میں ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا تھا لیکن اُردو شاعری میں اس تبدیلی کا باقاعدہ اظہار لاہور میں انجمن پنجاب کے اس مشاعرے سے ہوتا ہے جو ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی اور مولانا محمد حسین آزاؔد کی کارپردازی میں ہوا۔

مولانا حاؔلی نے ٹھیک لکھا ہے کہ اگر یہ مشاعرہ پندرہ برس پہلے کیا جاتا تو بالکل بے سود ہوتا ۱۸۷۴ء سے قبل اس نئے مشاعرے کے لئے ابتدائی مراحل طے ہو چکے تھے ایک طرف سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھی مغربی تعلیم حاصل کرنے پر لوگوں کو آمادہ کر رہے تھے دوسری طرف نئی نسل جس نے پہلی بار اس بات کا احساس کیا تھا کہ ادبیات کا معیار فارسی اور عربی

قدروں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا وہ مشینی ترقیوں اور دخانی انجنوں کے روپ میں یہاں بھی مصروف عمل ہو گیا تھا ہمارے یہاں جاگیر دارانہ نظام تیزی سے روبہ انحطاط تھا اور مغرب سے آیا ہوا تجارتی نظام آہستہ آہستہ اس کی جگہ لے رہا تھا مسئلہ صرف دستکاروں کے انگوٹھے کاٹنے کا ہی نہیں بلکہ ایک پورے نظام معیشت کو مفلوج کر دینے کا تھا ہندستان صدیوں سے گھریلو و چھوٹے پیمانے کی دستکاریوں اور صنعتوں کا ملک تھا یہاں معاشی ڈھانچہ بنیادی طور پر زراعتی تھا اور صرف اس کے خام مال و زرعی وسائل کو نوآبادیاتی مفاد کے لئے استعمال کرنے کی خاطر جان بوجھ کر بدیسی تاجروں نے پورا معاشی ڈھانچہ توڑ ڈالنے کی کوشش کی اس میں پوری طرح کامیابی تو ان کو نہ ہوئی مگر یہ ضرور ہے کہ ملکی معاشیات میں ایک طرح کی ابتری اور سخت انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

مذکورہ بالا دونوں بنیادی عوامل ایسے تھے جن کا نفسیاتی اثر ملک کے درمیانہ طبقے پر بڑی شدت سے پڑا ایک طرف تو یہی وہ طبقہ تھا جس نے مغرب سے آئے ہوئے علوم و فنون کو اپنانے کی کوشش کی اور دوسری طرف یہی وہ لوگ تھے جن کو سب سے زیادہ اپنی قومی سیاسی و معاشی پسماندگی کا احساس تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی سماج میں کچھ بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو سوچنے والے افراد سب سے پہلے ان سے متاثر ہوتے ہیں ان میں کچھ لوگ تو بہت ہی قنوطی اب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں اور کچھ زندگی کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال دینے کے قائل ہوتے ہیں۔ تبدیلیوں کو سمجھنا سماج میں جو
مختلف دھارے بیک وقت جاری وساری ہوتے ہیں ان کا پورا احساس
کرنا اور ناگزیر عوامل کے بارے میں حقیقت پسندانہ زاویہ نظر پیدا کرنا
صرف گنے چنے لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ مگر اس طرح کا ٹھوس، مدلل فکر عام
حالات میں صرف ایک ہی طبقے کے لئے مخصوص ہوتا ہے کیونکہ ہمارا تو
طور پر سماج کا ہر طبقہ اپنے لئے علمی و میدان فکر ڈھونڈ لیتا ہے زندگی کی
تلخ حقیقتوں کا احساس تو ہر ایک کو ممکن ہے کہ ہر ایک کر سکتا ہے مگر اس کے
بارے میں مثبت زاویہ نگاہ پیدا کرنا متوسط طبقے ہی کا کام ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے انیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے ہندوستان کے
متوسط طبقے کی اکثریت مسلمان تھی۔ وہ مسلمان جو ذہنی طور پر جنہوں نے کم و بیش
ایک ہزار برس سے سیاسی بالادستی کا مزہ چکھا تھا اس وجہ سے [illegible]
کشمکش و بحران میں پھنسے ہوئے تھے ان کے لئے کوئی [illegible] راہ باقی نہ رہ
گئی تھی۔ سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ ان کے سامنے یہ تھا کہ وہ ماضی
حال یا قدیم و جدید میں سے کس کو رد اور کس کو قبول کریں۔ مستقبل کا تو
ان کے سامنے کوئی تصور ہی نہیں تھا کیونکہ سامنے [illegible] کے لئے جس
اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں ختم ہو چکا تھا جب ملک کا بااثر
طبقہ خود ہی اس طرح کے اضطراب کا شکار تھا تو اس کے نمائندہ [illegible]
سے جو لوگ سامنے آئے ان کے یہاں بھی ذہنی پیچیدگیاں اور متناقض رجحانات
کی بے تکی آمیزش نمایاں تھی۔

اس بات کا واضح اعلان تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی یا چند مخصوص عاشقانہ یا متصوفانہ مضامین کی خفیف رد و بدل کے ساتھ باندھنے کا نام نہ یہاں خیال آرائی کی داد ملے گی۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی بلکہ نیا شاعر اسلوب سے زیادہ نفس مضمون اور مضمون آفرینی سے زیادہ سادگی اور اصلیت پر توجہ کرے گا یہاں غزل کے ایجاز و اختصار کے بجائے ربطِ مضمون اور وحدتِ فکر کی داد ملے گی۔

یہ معیار اردو شاعری کے لئے ہی نہیں خود حالی کے لئے بھی نیا تھا خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۷ سال کی عمر میں وہاں سے بھاگ کر حصول علم کی خاطر دہلی چلے آئے تھے یہاں پہلے پہل نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی سرکار سے وابستہ رہے اور یہیں شاعری شروع کی اور مرزا غالب سے کلام پر اصلاح لی۔ ان دونوں اہم کلاسیکی شعرا کے زیر اثر ان کی غزل پر بھی روایت کا رنگ کافی گہرا تھا گو انھوں نے کبھی مبالغہ آرائی خیال بندی اور لفظی تماشائی کے اس دستور کو نہیں اپنایا جو ناسخ اور ان کے شاگردوں کے زیر اثر عام ہوا تھا۔ پھر بھی ان کی شاعری میں روایتی غزل گوئی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ ملتی ہے گو کہیں کہیں کیفیات کو خارجی بیانات کے آئینے میں ماننی پڑتی ہے۔

شاعری سے متعلق ۱۸۷۴ء سے پہلے تک حالی کا ادبی میلان انھیں کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

"شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ

قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ بیس برس کی عمر سے چالیس سال تک
بیل کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک
سارا جہاں طے کر چکے۔"

روایتی شاعری میں خاصہ کامیاب ہونے کے بعد حالی کو نئے ادبی تقاضوں کا احساس ہوا اور ان معیاروں کی طرف توجہ مبذول ہوئی جس کے لیے انجمن پنجاب نے ادبی سرگرمیاں شروع کی تھیں تو حالی آزاد کے ہمراہ انجمن پنجاب اور گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو سے متعلق تھے۔ اس طرح ایک تو انگریزی سے کتابوں کے تراجم کی مدد سے ان کا بالواسطہ تعلق قائم ہو گیا تھا اور دوسرے نئی ادبی فضا کی سمت کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔

آزاد نے آب حیات کے دیباچے میں اس بات پر سخت احتجاج کیا ہے کہ۔

"ارباب زمانہ نے متفق اللفظ ہو کر کہہ دیا کہ اردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے"

انھوں نے شاعری میں وسعت موضوع، مضامین اور اظہار اصلیت پر زور دیا ان کے نزدیک تخیل اور خیال بندی سے زیادہ جذبات کا بیان اور مشاہدہ کا لطف زیادہ حقیقی اور پر اثر ہے اور اسی بنا پر حالی کی وہ نظمیں جو انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی گئیں خاص طور پر ان خصوصیات سے معمور ہیں۔

ان مشاعروں میں حالی نے چار نظمیں پڑھیں۔ برکھا رت، نشاط امید

حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف ان کی بنیادی خصوصیات کی تلاش کی جائیں تو ظاہر ہوگا کہ ان میں قافیہ کے بجائے خیال کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور مال کے اعتبار سے حالی نے ایسے مطالب منتخب کئے ہیں جن کا ہماری روایتی شاعری میں زیادہ چلن نہ تھا سادگی ان کا جوہر ہے اور وحدت خیال کو فکری ربط اور اسلوب و ادا کے سلسلے کی مدد سے قائم رکھا ان کی خوبی ان میں تخیل سے زیادہ مشاہدہ داخلی کیفیت سے زیادہ بیانیہ اور تشبیہ استعارے کی آراستگی کے بجائے سادگی ادا کا لطف قائم رکھا گیا ہے۔

ہیئت اور نفس مضمون دونوں اعتبار سے یہ نظمیں انقلاب آفریں کہی جا سکتی ہیں گو مثنوی کی صنف ... میں پرانی ہے مسلسل بحروں کا رواج بھی پایا جاتا تھا لیکن حالی نے ان اصناف کو ایک خاص نظر سے استعمال کیا اور ان میں ... مثنوی کی طرح حسن و عشق کا کوئی قصہ نظم کیا اور نہ مسلسل غزلوں کی طرح کوئی محدود موضوع پیش نظر رکھا اس طرح نظم کی باقاعدہ ابتدا ہوئی:

حالی نے اپنے ذہنی ... کی اس منزل کو اس طرح بیان کیا ہے

"نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں ... چاروں طرف کھلی ہوئی ہیں اور خیال کیلئے کھیلنے کیلئے ... تنگ رہا ... اسی تردد میں ... یہ حال تھا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا"

سادگی ادا، وحدت خیال اور صلابت کے سہارے اس قسم کی شاعری

زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی جب تک نظم گو شاعر کے لئے فکر کا وافر ذخیرہ نہ ہو اُس وقت تک وہ صرف " ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت" پر اکتفا نہیں کر سکتا۔

حاؔلی کو یہ فکری ذخیرہ سر سید کی تحریک سے ملا۔ سر سید احمد خاں نہ صرف مسلمانوں میں مغربی تعلیم، سائنس تجارت اور حرفت کو عام کرنے کا درس دے رہے تھے بلکہ اسی درس کو وہ مسلمانوں کی بقا کے لئے لازمی قرار دیتے تھے سر سید کے لئے اصلاح قوم کا خیال صرف نیک نفسی کے جذبے کے زیر اثر پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تاریخی ضرورت کا تقاضہ تھا ان کے لئے یہ سوال مسلمانوں کی حیات و موت کا سوال تھا اس تحریک سے حاؔلی کی شاعری کو شعور اور مقصد ملا۔ حاؔلی اپنی ذہنی مسافت کی اس تیسری منزل کی طرف خود اشارہ کرتے ہیں:-

" ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اسی میدان کا مرد ہے ایک دشوار گذار راستے میں رہ نورد ہے۔۔۔ قوم کے اس سچے خیر خواہ نے۔۔۔۔ آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زباں سے کچھ کام نہ لینا شرم کی بات ہے۔"

اور اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے مسدس حاؔلی میں " قوم کے لئے اپنے ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں تاکہ وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے" شاعری کو سماجی

اصلاح اور مقصدی ترویج کا ذریعہ بنانے کی یہ سب سے اہم کوشش تھی۔
حالی نے اپنے دیوان کے معرکۃ آلارا مقدمے مقدمہ شعر و شاعری کی ابتدا ہی میں شاعری میں سماجی شعور کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کی مدد سے لوگوں کے ذہن اور ان کی قوتِ عمل میں جو حرکت پیدا کی جا سکتی ہے اس سے کام لینے کی تلقین بھی کی ہے اس کے علاوہ خیال بندی، مضمون آفرینی، مبالغہ آرائی اور صناعی کے بجائے ملٹن کے الفاظ میں "اصلیت، سادگی اور جوش" پر زور دیا ہے انھیں اصول کے ماتحت وہ غزل میں اخلاقی مضامین اور حقیقی جذبات کی ترجمانی پر اصرار کرتے ہیں مثنوی اور قصیدہ میں اصلیت اور اخلاقی عنصر کی موجودگی پر زور دیتے ہیں اور مرثیہ کو ایک کارآمد صنف بنانے پر مصر ہیں۔
یہی نہیں حالی نے وکٹورین عہد کے انگریزی ادب سے بالواسطہ اثر قبول کر کے ادب کے اخلاقی پہلو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اور آرٹ کو قوم کی اخلاقی حالت درست کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ اسی سایہ ان کو شاعری میں متانت اور سنجیدگی کا اس قدر گہرا رنگ پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے نقادوں نے ان کی شاعری کو آخرت کے لیے زادِ راہ جمع کرنے سے تعبیر کیا۔
مسدس حالی یا "مد و جزرِ اسلام" حالی کا کارنامہ ہے ایک انوکھی اور روایتی معیار کے اعتبار سے غیر ادبی موضوع پر حالی نے بڑی لگن، داخلی کیفیت اور فن کارانہ ربط کے ساتھ قلم اٹھایا ہے یہ صحیح ہے کہ یہاں بھی حالی کی دوسری نظموں کی طرح، تخیل سے زیادہ مشاہدہ اور احساس سے زیادہ عقل ہی کی قوتیں کارفرما ہیں اس میں لطافت اور جمالیاتی کیفیت کی بلندی پوری طرح نظر

نہیں آتی لیکن اس کے ہر مصرعے میں جو جذبہ جوش اور خلوص ہے وہ مسدس کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ مسدس میں بیانیہ شاعری زیادہ ہے اور اکثر جگہ خطابت کا انداز بھی پیدا ہو گیا ہے حالیؔ کی عظمت کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ روایتی آراستگی تشبیہہ و استعارے کی آرائش اور حسن و عشق کی رنگینی کا سہارا لئے بغیر صرف جذبے کی شدت اور خیال کی قوت پر اتنی طویل اور مربوط نظم لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

"مسدس قوم کے تنزل کا آئینہ ہے پہلے اسلام کے ظہور سے قبل کا ایک خاکہ ہے پھر اسلام کے طلوع ہونے اور مسلمانوں کے سیاسی اور علمی عروج کی داستان ہے پھر ان کی انتہائی پستی اور تنزل کا نہایت دردناک بیان کر کے انھیں نئی تعلیم اور نئے امکانات سے فائدہ حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے سر سید احمد خاں نے اسی نظم کے لیے کہا تھا "خدا جب حشر میں مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لایا تو میرا جواب یہی ہوگا کہ حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں" اور حقیقتاً مسدس کو اس دور میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی علی گڑھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں جو جلسے ہوتے تھے انہیں مسدس کے کچھ حصے ضرور پڑھے جاتے تھے عرصے تک ہر مسلمان گھرانے میں، ہر مذہبی اور سوشل اجتماع کے موقع پر مسدس کے چند بند ضرور پڑھے جاتے تھے بہت سے شاعر قومی اور اصلاحی شاعری کی طرف مسدس ہی کے زیر اثر متوجہ ہوئے اور اسی طرز میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

مسدس حالی نے حالی کی دوسری نظموں کی کامیابی کو بہت کچھ ماند کر دیا ۔
برکھا رت اور حب وطن، کے علاوہ مناجات بیوہ' چپ کی داد' اور شکوۂ ہند
خاص طور پر قابل ذکر ہیں مرزا غالب اور حکیم محمود علی خاں کے جو مرثیے انھوں نے
لکھے ہیں وہ بھی اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ روایتی رنگ سے الگ ہٹ کر
ان میں حقیقی جذبے اور اسلوب کی سادگی سے کام لیا گیا ہے غالب کا مرثیہ
اس تعریف کا مستحق ہے جو ان کی دوسری تصنیف 'یادگار غالب' کے سلسلے میں
کی گئی یعنی ایک 'شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی سرگذشت
لکھی ہے اور آشنائے فن ہو کر لکھی ہے" علاوہ ازیں ان کی مختصر اخلاقی اور
اصلاحی نظمیں بھی متانت اور سادگی کے لحاظ سے اہم ہیں ۔

حالی نیچرل شاعری پر زور دیتے ہیں اخلاقی تلقین اور سماجی اصلاح کا
بار بار ذکر کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں
نے لفظی صناعی کے بجائے خیال اور جذبے کو شاعری کا معیار قرار دیا اور مبالغہ
آرائی اور مضمون آفرینی کی روش سے الگ ہٹ کر سادگی ادا اور فکری وحدت کی
نظیر قائم کی اور اس فلسفیانہ استدلال، درد قومی، اور اصلیت کے ان عناصر
نے اس سیدھی سادی نظم میں روایتی شاعری سے زیادہ جاذبیت پیدا کر دی
"اس کا اثر نہ صرف بعد کے اردو شعرا پر پڑا بلکہ دوسری زبانوں میں بھی اور
خصوصاً ہندی میں میتھلی شرن گپت کی 'بھارت بھارتی' کی شکل میں ظاہر ہوا۔

آخر میں حالی کی غزل گوئی کا تذکرہ بھی ضروری ہے ۔ غزل اپنی مخصوص
علامتوں اور داخلی فضا کے لحاظ سے بہت کچھ روایتی صنف ہے لیکن حالی نے

اس صنف میں بھی ندرتِ ادا اور جدت بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا شروع میں شیفتہ کے مذاق شعری کا اثر ان پر بہت گہرا تھا اور شیفتہ کا مذاق شعری جس پر غالب اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ اس وقت تک غزل کو معیاری تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے "جب تک بقول ان کے "تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کردم" ندرت اور جدت سے عبارت کا یہ رنگ حالی کی طبیعت میں غالب کے زیر اثر اور زیادہ نمایاں ہوا غالب خود ندرتِ ادا اور بانکپن کے قائل تھے اور روایت اور معاصرین سے الگ اپنا انفرادی راستہ نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حالی کی طبعی سنجیدگی اور متانت اور سعدی اور میر کے گہرے اثرات نے ان کی غزلوں کو محض اخلاقی نظمیں یا "گل و بلبل" کی روایتی داستانوں کے بجائے خلوص اظہار، تابناک تجربے اور ندرت اظہار کی کامیاب مثالیں بنا دیا حالی کی غزلیں تغزل سے معمور ہیں اور انھوں نے ایسے دور میں تغزل کی دولت حاصل کی جب غزل اس نعمت سے تقریباً محروم ہو چلی تھی۔

مرثیہ نگاری کے بارے میں اگر حالی نے صرف چند نظریاتی یا اصولی مباحث اُٹھائے ہوتے تو شاید اس کی اہمیت زیادہ نہ ہوتی لیکن عملی طور پر حالی کے مرثیوں نے ثابت کر دیا کہ مرثیے کی سرحدوں کو وسیع کیا جا سکتا ہے اور اسے "آخرت کے زاد راہ" یا "رونے رلانے کے سامان" کے بجائے سماجی اظہار کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور اس میں تاریخ کے عروج و زوال کی داستان نظم کی جا سکتی ہے اور ایک فرد کے بجائے ایک قوم یا اس کے ایک دور کا مرثیہ بنایا جا سکتا ہے "غالب اور محمود علی خاں کے مرثیے صرف حالی کے ذاتی دکھ درد یا ان کے مرحوم دوستوں کی ذات و صفات کا بیان ہی

نہیں ہیں بلکہ ایک دور کے تہذیبی مد و جزر کے آئینہ دار ہیں۔

اس طرح حالی کی شاعری ایک ہشت پہلو نگینہ ہے جس کی روشنی نے مختلف اصناف میں رہبری اور رہنمائی کی اور ایک ایسے دور میں جب اردو شاعری روایت کے اندھیروں اور فکری افلاس کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھی تجربے اور اجتہاد مدرتِ فکر اور جدت بیان کی مشعلیں روشن کیں۔ ظاہر ہے کہ حالی کی شاعری کمزوریوں اور معائب سے خالی نہیں ہے لیکن یہ غلطیاں ایک پیش رو اور اجتہاد پسند شاعر کی غلطیاں ہیں جن سے آگے آنے والوں کو ہدایت ملتی ہے اور متاخرین کے لئے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ حالی کا اجتہاد معنوی ربط اور فکر پر ان کا زور دینا اور سادگی، اصلیت اور سماجی معنویت پر اصرار ایسی باتیں ہیں جن سے آج کی نسل بھی بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔

ابو محمد سحر

حالی بحیثیت قصیدہ گو

حالی اردو شاعری کی مختلف اصناف کی ایسی روایات سے دل برداشتہ تھے جو انھیں حقیقت سے دور اور قومی مفاد کے منافی نظر آتی تھیں لیکن وہ کسی صنف کو فی نفسہ بیکار نہ سمجھتے تھے۔ غزل کی تنقید کے سلسلہ میں حالی اور کلیم الدین میں یہ ایک بنیادی فرق ہے کہ حالی غزل کے روایتی مضامین کی مذمت کرتے ہیں اور اس کو زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم کنار کرنا چاہتے ہیں اور کلیم الدین اس کو ایک نیم وحشی صنف سخن قرار دیکر اس کی ہیئت پر ایک ضرب کاری لگاتے ہیں۔ قصیدہ سے حالی اگرچہ غزل سے بھی زیادہ بدظن تھے لیکن اس کے متعلق بھی ان کا نقطۂ نظر تخریبی نہ تھا۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں جہاں انھوں نے قصیدہ کے محدود دائرۂ مضامین، جھوٹی تعریف، مبالغہ آرائی اور تخیل آفرینی پر لعنت و ملامت کی ہے وہاں اس کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ وہ قصیدہ کو صرف اس کی ہیئت کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اصل موضوع یعنی مدح اور

ہجو کے دائرے میں بھی ایک ضروری صنف سمجھتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لیئے جائیں اور اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے جوش اور ولولہ پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا اور بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سکدوش نہیں ہو سکتا"۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی روایتی قصیدہ گوئی کے مخالف ہونے کے باوجود انھوں نے اس صنف کو متروک نہیں ٹھہرایا اور غزل، مثنوی، مرثیہ، مسدس اور رباعی وغیرہ کی طرح اس میں بھی طبع آزمائی کی۔ انکے کلام میں سات مکمل اور تین نامکمل قصیدے ملتے ہیں۔ اول الذکر سات قصائد میں سے دو قصیدے نعت میں ہیں۔ تین قصیدے نواب سرآسماں جاہ، ملکہ وکٹوریہ اور نظام دکن کی شان میں ہیں۔ ایک قصیدہ علی گڑھ کالج کے ایک وفد کی جانب سے حیدرآباد میں ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں زیادہ تر نظام دکن کی مدح ہے اور ضمنی طور پر بعض اعیان حکومت کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ایک قصیدہ موسوم بہ قصیدہ الغیاثیہ یا عرض حال ہے۔ ناتمام قصیدوں میں دو قصیدے نواب کلب علی خاں والئی رام پور اور سرسید کی مدح میں اور تیسرے قصیدے میں صرف تشبیب کے چند اشعار ہیں۔

حالی کے اکثر قصیدے مدحیہ ہیں لیکن وہ قصیدے کے روایتی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان میں مبالغہ تخئیل اور شان و شکوہ کی وہ

کارفرمائی نہیں ہے جو قصیدہ کا سرمایۂ ناز خیال کی جاتی ہے۔ اسی طرح ان میں قصیدہ کے اجزائے ترکیبی کے التزام میں بھی روایتی اہتمام نہیں ملتا۔ صرف ایک نعتیہ قصیدے میں یہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ قصیدہ شروع سے آخر تک نہایت ہموار ہے۔ اس کی تشبیب فخریہ مضامین پر مشتمل ہے جس میں روز بیان موجود ہے۔ گریز سادہ لیکن برجستہ ہے اور مدح، عرض حال اور دعا میں زور بیان کے ساتھ مذہبی خلوص اور جوش عقیدت بھی جاری و ساری ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں گے اُن کے ناز ضرور

خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور

کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور

شرح نقطہ کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور

کرنے جاؤں جو حق سے عذر گناہ
لے کے آؤں نوید عفو قصور

لوں ملائک سے داد حسن کلام
گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

وہ شہنشاہ امتی جس کا
یاں گنہگار اور واں مغفور

چرخ کو دے اگر وہ حکم سکوں
ہو غلط نسخہ سنین و شہور

اے ترا ما یہ فہم سے برتر
اے ترا نام عرش پر مسطور

اب دعا یہ ہے اے شفیع امم
بسکہ بیتاب ہے دلِ رنجور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو تیرا مذکور

لیکن یہ حالی کے قصائد کا عام رنگ نہیں ہے۔ مجموعی حیثیت سے

ان کے قصائد میں ایک بدلی ہوئی فضا ملتی ہے۔ محض اس وجہ سے کہ ان میں روایتی محاسن نہیں ہیں ان کو ناقابل توجہ سمجھنا ایک سطحی بات ہوئی کیونکہ اس کا راز صلاحیت کے فقدان کے بجائے شاعر کے اجتہاد میں مضمر ہے۔

قصیدہ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تصور مدح کے ساتھ وابستہ تھا، ہجو اور دوسرے مضامین کو بھی قصیدہ کا موضوع بنایا گیا ہے اور اس قسم کے بعض قصیدے تاریخی و ادبی اہمیت کے مالک ہیں لیکن زیادہ تعداد مدحیہ قصائد کی ہے۔ ان کی روح مبالغہ، تخئیل، علم و فن کا مظاہرہ، اور شوکت الفاظ تھی اور ایک بندھے ٹکے دائرے میں ان سے عہدہ برآ ہونا شاعر کے کمال کی کسوٹی سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ اس کے ساتھ فنکاری کا ایک نہایت خوبصورت تصور بھی وابستہ تھا جیسا کہ ولی کے اس شعر سے ظاہر ہے جس میں انھوں نے معشوق کے سراپا کو انوری کے قصیدے سے تشبیہ دی ہے۔

تو سر سوں قدم تلک جھلک میں
گویا ہے قصیدہ انوری کا

لیکن پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی بنیاد حقائق سے زیادہ دقائق پر رکھی جاتی تھی۔ یہاں ہمیں اس کے اسباب سے غرض نہیں ہے۔ امیر اور ان کے معاصرین قصیدہ کی انہی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور ان کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اردو شاعری میں ایک نئی

تحریک رونما ہوئی یوں تو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے انگریز ہندوستان میں بہت پہلے سے دخیل ہو چکے تھے لیکن باضابطہ طور پر ان کا اقتدار ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے حسرت ناک انجام کے بعد مسلط ہوا شروع میں تو فضا بہت مسموم رہی لیکن رفتہ رفتہ معاشرتی اور ذہنی تبدیلیوں کے لئے زمین ہموار ہوئی اور ہندوستان پر مغربی تہذیب اور خیالات کی پرچھائیں پڑنے لگی اس نئے ذہنی اور معاشرتی ماحول میں انگریزی زبان و ادب کے بعض اثرات کے ماتحت اُردو کے ادیبوں میں ادب اور زندگی کے رشتوں اور اس کی افادیت کا شعور پیدا ہوا۔ شاعری کی دنیا میں اس شعور نے لاہور کے مشہور مناظموں میں عملی تشکیل اختیار کی۔ ان مناظموں میں حالی بھی شریک تھے۔ ان کی مثنویاں برکھا رت، نشاط امید، رحم و انصاف اور حب وطن انہی مناظموں کی یادگار ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس تحریک کی بنا آزاد نے ڈالی تھی لیکن اسے قبول عام کی سند حالی کے کلام نے دی۔ جیسا کہ حالی نے ایک موقع پر لکھا ہے کچھ تو ان کی طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔" چنانچہ طبعاً" اور اصولاً" انھوں نے اصلیت، افادیت اور سادگی وغیرہ کو شاعری کا جوہر اصلی قرار دیا اور دوسری اصناف کی طرح شعوری طور پر ان کو قصیدہ میں بھی داخل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے مضامین کے ساتھ اصلیت اور ایک فطری اسلوب ان کے قصائد کی امتیازی خصوصیات بن گئیں۔

حالی کے قصیدوں میں مدح اور دعا کے اجزا تو مستقل طور پر موجود ہیں لیکن انھوں نے تشبیب پر زیادہ زور نہیں صرف کیا ہے، وہ عموماً تمہید کے طور پر موقع کی مناسبت سے چند شعر کہہ کر مدح شروع کر دیتے ہیں۔ سر سید کی شان میں ایک نا تمام قصیدے میں قوم کی حالت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہاں نہیں ہے یارو سب پہ کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے
ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے
اس پر بھی اے عزیز و ہے جائے فخر تم کو
دنیوں میں دینِ بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

قصیدہ تہنیت بحضور نظام دکن میں کہتے ہیں۔

زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے شادمانی کا
فلک پیری میں دم بھرتا ہے ان روزوں جوانی کا
نظر آتی ہے بے جام و سبو سے خلق متوالی
ہوا میں نشہ ہے گویا شراب ارغوانی کا

ان تمہیدوں کی مختصر تمہیدوں کے مقابلے میں قصیدہ تہنیت بجناب سر آسماں جاہ کی تمہید قدرے طویل ہے۔ چونکہ یہ عید الفطر کی مبارکباد میں ہے اس لئے اس میں انھوں نے پہلے عید کی خوشیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد

ان خوشیوں کو رعایتی کہہ کر قوم کے سرپرستوں اور بہی خواہوں کی خوشی کو اصل خوشی قرار دیا ہے اور اس طرح وزیر دکن کی مدح کا پہلو نکالا ہے۔

عید کی خوشیوں کا بیان ملاحظہ ہو

مہ صیام گیا اور روز عید آیا — خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا
شگفتہ آتے ہیں اس طرح عید گاہ سے لوگ — کہ گنج انھوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا
عزیز دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم — خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا
حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے ہیں — کہ دن خدا نے نمائش کا ان کو دکھلایا

حالی کو مبالغہ اور اغراق سے تنفر تھا لیکن مدح سے ان کو طبعی مناسبت تھی۔ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کرنال کے سپرنٹنڈنٹ پولیس (مسٹر برور) سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ انگریزوں کی مدح میں بھی ان کے قصیدوں میں وہی خلوص اور جوش دکھائی دیتا ہے جو نواب کلب علی خاں، آصف جاہ سادس، سر آسماں جاہ اور سر سید کی تعریف میں ہے۔ لیکن اس کی بنا پر ان پر خوشامد اور چاپلوسی کا الزام لگانا بڑی حد تک درست نہ ہوگا کیونکہ ایسا کرنے میں ان کے پیش نظر ذاتی مفاد نہیں بلکہ قومی مفاد معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت نے انھیں شمس العلما کا خطاب ضرور دیا اور حیدرآباد سے انھیں وظیفہ بھی ملتا تھا جس کے لیے وہ سر آسماں جاہ کے سامنے سراپا سپاس دکھائی دیتے ہیں لیکن جس دور سے ہمیں سروکار ہے اس میں اکثر ممتاز شخصیتیں حکومت انگریزی کے خطابات سے سرفراز اور والیان ریاست کے وظائف سے

فیضیاب ہوئیں سرسید، آزاد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، نذیر احمد، منشی ٰمیرٹھی، ور شبلی سبھی حکومت انگریزی کے خطاب یافتہ تھے۔ شبلی نظام دکن سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور ۱۹۱۲ میں یہ رقم رھا کر تین سو روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ ''اقلیم سخن'' کی ان ''شریف تر'' ہستیوں کی یہ روش دراصل اس سیاسی مسلک کا ایک جزو تھی۔ جو ۱۸۵۰ کی ناکام بغاوت کے بعد ایک لازمی نتیجے کے طور پر نمودار ہوا تھا اور جس کے سب سے بڑے نمائندے راجہ رام موہن رائے اور سرسید حمد خاں تھے۔ ''شریف النفس'' حالی سرسید کی تحریک کے ہمنوا بلکہ نواگر تھے، وہ اسے اپنا ایک قومی فریضہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو وفادار ثابت کر کے حکومت برطانیہ اور انگریز حکام کی خوشنودی حاصل کریں اسی طرح والیان ریاست کی سرپرستی اس وقت علی گڑھ کی تحریک کی کامیابی کیلئے سب سے بڑی ضمانت تھی۔ اس لیئے جب وہ انگریز حکام اور والیان ریاست کے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوتے دیکھتے تھے جو ان کی رائے میں قوم کی ترقی اور اصلاح کے عین مطابق ہوتا تھا تو ان کا پرخلوص اور دردمند دل جذبہ تشکر سے لبریز ہوجاتا تھا۔ ان کے قصیدے زیادہ تر اسی جذبہ کے اظہار پر مبنی ہیں اس کے لیئے انھوں نے ایک اخلاقی معیار بھی بنالیا تھا ''شکریہ گورنمنٹ برود'' کے مطلع میں کہتے ہیں۔

سچ مت کیا ادا شکر البشر جس نے آشکار

اس نے کیا نہ شکر خداوند کردگار

تاہم بعض موقوں پر حالی نے انگریزی حکومت کی برکات کے بیان میں بڑے غلو سے کام لیا ہے ستی اور ٹھگی کے انسداد تعلیم کی ترقی اور حسن انتظام وغیرہ میں تو صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے لیکن انھوں نے کہیں کہیں انگریزوں کی غلامی کو آزادی کا نام دے کر اس پر جس طرح فخر کیا ہے اس کا جوازنہ تو جوش تشکر میں دکھائی دیتا ہے اور نہ وفاداری کے اظہار میں، کیونکہ یہاں حالی ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے وفد کی جانب سے جو قصیدہ حیدرآباد میں ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا اس کے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

ہم کہ ہیں وکٹوریہ کے عہد دولت میں ملے
امن و آزادی کی ہم نے لھائی ہے پرسوں ہوا

اسی طرح قصیدۂ جشن جوبلی میں جو ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ہے اور ۱۸۸۷ میں انجمن اسلام لاہور کے سپاسنامے کے ساتھ ممدوحہ کے حضور میں گزارا گیا تھا کہتے ہیں۔

وہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس آج — ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دور تعصب تھا یہ ہے دور انصاف — وہ جنگ کا موسم تھا یہ ہے صلح کا رہبر
بند اپنے فرائض ہیں ہیں ہندو نہ مسلماں — معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں مندر

اس قصیدے کا خاتمہ اس عجیب دعا پر ہوتا ہے۔

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایہ یزداں — اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایہ قیصر

یہ اشعار حالی اور ان کے زمانے کے سیاسی شعور کے بھونڈے نمونے ہیں

یہاں حالی پر اقبال کا وہ طنز پوری طرح صادق آتا ہے جو انھوں نے ایک شعر ۲
میں ظاہر کیا ہے۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت   ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دعا کے شعر میں حالی پرانے قصیدہ گویوں کے دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں پہلے مصرع میں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن دوسرا مصرع لکھنے میں حالی حق بجانب نہ تھے یہ خوشی کی بات ہے کہ پرانے قصیدہ گویوں کی ایسی تمام دعاؤں کی طرح حالی کی دعا بھی پوری نہیں ہوئی اور قیصر کے گھرانے پر سایۂ یزداں رہنے کے باوجود ہند کی نسلوں پر سایۂ قیصر نہیں رہا۔

لیکن حالی کے قصائد میں مدح کا رنگ عام طور پر اس سے مختلف ہے جیسا کہ قصیدۂ خیلی میں پیدا ہوگیا ہے۔ حالی سے پہلے مدح میں قصیدہ گویوں کے سامنے ذاتی اوصاف کے بجائے اس طبقہ کے اوصاف ہوتے تھے جس میں سے ممدوح کا تعلق ہوتا تھا۔ ہر طبقہ کے اوصاف مقرر تھے ان مقررہ اوصاف کے دائرے میں تخئیل آفرینی اور بلندیٔ فکر کی نمائش کی جاتی تھی جس کا حاصل سوا بے سروپا مبالغہ کے اور کچھ نہ ہوتا تھا اسی رنگ میں ممدوح کے ساز و سامان کی تعریف بھی لازمی طور پر کی جاتی تھی حالی نے ایک طرف مقررہ اوصاف اور ساز و سامان کی تعریف ترک کر دی تو دوسری طرف انھوں نے ممدوح کے اصلی اوصاف کو ایک فطری پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ ان کے مدحیہ اشعار میں مبالغہ اور تخئیل کو بالکل دخل نہیں ہوتا کیونکہ مبالغہ اور تخئیل کا اس قدر استعمال جتنا کہ شعریت کے لئے ضروری ہے وہ بھی کرتے ہیں۔

خاص بات یہی ہے کہ وہ فکر کی پرواز میں حقیقت سے غافل نہیں ہوتے

مزید یہ کہ اوصاف کے انتخاب اور ان کے بیان میں وہ عموماً اپنے قومی نقطۂ نظر سے کام لیتے ہیں اور ایسے اوصاف خصوصیت کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں جن میں علم و فن کی قدردانی، فلاح عامہ اور قومی ہمدردی کے پہلو ہوتے ہیں۔ نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہتے ہیں۔

مرجع ارباب علم و فن ہے اسکا باب فیض — یہ وہ دعویٰ ہے کہ خود دربار ہے جس کا گواہ
گر مناظر ہیں تو ہیں سردفتر اہل کلام — اور محدث ہیں تو ہیں سرچشمۂ علم و ہدیٰ
زمرۂ اہل یقیں یا جمعیت اہل سلوک — نکتہ چینان مجسطی خردہ گیران شفا
شاعر شیریں نفس یا شاطر سنجیدہ رائے — فیلسوف مستدل یا عارف علت ربا

سرسید کی تعریف میں اہل قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے ہو — اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا ہوا ہے
وقف اپنا کام اپنی جان اپنی مال اپنا — یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
تعلیم کی ہماری بنیاد اس نے ڈالی — ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

قصیدۂ تہنیت حضور نظام دکن میں حالی نے خاص طور سے اس کا خیال رکھا تھا کہ مدح اصل سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رعیت شاد ملک آباد اور آزاد ہر ملت — ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا
ہر اک ملت ہر اک مذہب سے ہے یکساں سلوک اسکا — کوئی گر سیکھے اس سے جہاں کی پاسبانی کا
تعصب جنبہ داری اختلاف مذہب و ملت — نہیں کوئی مزاحم اس کے دریا کی روانی کا
ہوئے ہیں جس قدر ابواب خیر اس عہد میں جاری — کریں اس کو بیاں کیا منہ ہے الفاظ و معانی کا
شفاخانے بنے اور درسگاہیں ملک میں قائم — ہوا ہے یاں جو حق تھا ہر اک قاصی و دانی کا

وہ کالج جس نے مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے
اسی منبع سے جاری ہے وہ چشمہ زندگانی کا

قصیدۂ غیاثیہ یا عرض حال کا رنگ حالی کے تمام دوسرے قصائد سے جداگانہ ہے۔ اردو قصائد میں بھی یہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی حالت زار کو پیغمبر اسلام کے حضور میں پیش کیا ہے اور بارگاہ خداوندی میں مسلمانوں کی بہتری کے لیئے دعا کرنے کی التجا کی ہے۔ اس قصیدے میں حالی کا وہ خلوص دردمندی اور مذہبی عقیدت سمٹ کر آگئی ہے جو ان کی قومی شاعری میں جا بجا پھیلی ہوئی ہے۔ یہ قصیدہ کسی زمانے میں دعا کی شکل میں بہت مشہور رہ چکا ہے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

یاں تنگی ہیں سونے کو درم لے کے پرائے
اور سکہ۔ واں شہر میں مدت سے نیا ہے

فریاد ہے اے کشتئ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

ان قصیدوں کے علاوہ حالی کے کلام میں چار نظمیں اور ہیں جنھیں اگرچہ قصیدہ کا عنوان نہیں دیا گیا ہے لیکن جو اپنی ہیئت یا ہیئت اور موضوع دونوں کے اعتبار سے قصائد میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان میں "شکریہ مسٹر برور" کا ذکر ضمنی طور پر پہلے آچکا ہے۔ باقی تین نظمیں مناظرہ واعظ و شاعر" "مسٹر مارسین کی روانگی ولایت" اور" اشعار مدحیہ " (اسٹنٹ گورنر پنجاب کی شان میں)

ہیں۔ شکریہ مسٹر۔ وہ اور اشعار مدحیہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے انھیں حالی نے دوسروں کی فرمائش پر لکھا تھا۔ مارسین کی روانگی ولایت بھی ایک الوداعی نظم ہے جس میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور مارسین کی خدمات کا اعتراف مدحیہ انداز میں کیا گیا ہے۔ مناظرہ واعظ وشاعر قصیدہ غیاثیہ کی طرح دور جدید میں قصیدہ گوئی کے اس رجحان کا ترجمان ہے جس کے ماتحت قصیدہ میں مدح اور ہجو کے علاوہ مستقل طور پر دوسرے مضامین کو داخل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک طربیہ نظم ہے جس میں مناظرے کے ساتھ واعظ اور شاعر کی ذہنیتوں کو ایک نہایت دلچسپ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ کامیڈی کے عنصر نے اس میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی ہے جس سے اس کا ادبی وقار اور بھی بڑھ گیا ہے۔ حالی نے عالم تصور میں ارباب صفا کی ایک مجلس سجائی ہے جہاں مولوی، فلسفی، صوفی، واعظ اور شاعر رد و قدح میں مصروف ہیں۔ شاعر کی بدزبانیوں کی وجہ سے یہ رد و قدح طول پکڑ جاتی ہے اور واعظ و شاعر میں مناظرہ شروع ہو جاتا ہے۔ واعظ شاعر کی مذہبی تردید میں اس کی بیہودہ گوئی، قول و عمل کے فرق، مبالغہ آرائی، جھوٹی تعریف اور گداگری وغیرہ کی مذمت کرتا ہے۔ جواباً شاعر بھی واعظ کی حرص و آز، ریاکاری، مکاری اور تفرقہ بازی وغیرہ کے بیان اور اپنی کمزوریوں کے جواز میں ایک لمبی تقریر کرتا ہے۔ شاعر کی طاقت لسانی کے آگے جب حضرت واعظ کی کچھ پیش نہیں چلتی اور حاضرین مجلس ان کی شکست پر مسکرانے لگتے ہیں تو شرمندہ ہو کر

بات بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاعر کی سب سے بڑی کمزوری یعنی اسکی شاعری کا تمسخر آمیز انداز میں ذکر چھیڑتے ہیں۔ لیکن شاعر پر یہ حربہ بھی کارگر نہیں ثابت ہوتا اور ایسا جواب ملتا ہے کہ واعظ کو چپ ہوتے ہی بن پڑتی ہے اور ساری محفل قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے۔ یوں تو یہ مناظرہ شروع سے آخر تک لطیف طنز اور سنجیدہ ظرافت کی ایک کامیاب مثال ہے لیکن اس کے آخری حصہ میں یہ دونوں عناصر انتہائے کمال کو پہنچ گئے ہیں۔

چھپتی اور بکتی تھی خوش دل یہ کی تقریر جب
ہو گئے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا

دل میں واعظ نے یہ ٹھانی اور سمجھا کہ اب
چھیڑ کر کچھ اس کو محفل میں رسوا ہوا

ظاہرا تو بچ گیا اس سے وہ شاعر کے لئے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا

ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ ورد کار
منزل واعظ زیادہ حد سے ہوتا ہے برا

کیجئے فکر شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق
آپ نے دیوان مرتب کیوں نہیں اب تک کیا

ہم ہنسی کی اور باتیں کیجئے انصاف گر
ہے غرض ہے آپ کی دیوان شعر کا مرا

عرض کی شاعر نے حضرت واعظ سے ہے یہ سچ
ورنہ میں نے کیا اور مجموعہ اشعار کیا

تھا اب وہ دن گئے جو شاعروں کی قدر تھی
شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر
دیکھتا ہوں شاگرد ہو جاؤں کسی استاد کا

اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہے فن شریف
کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا

مختصر یہ کہ حالی نے صنف قصیدہ سے وہ کام لیا جو ان کے عہد میں لیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے اول تو خصائص کی سچی مدح کی طرف توجہ کی پھر اس سچی مدح کو اپنے زمانے کے بعض آقاؤں سے ہم آہنگ کرکے قصیدہ کو

قومی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مدح کے علاوہ
اس میں دوسرے موضوعات کو جگہ دے کر اس کی دنیا کو وسیع کرنے کی سعی
کی۔ ان کے نزدیک یہ شاعر کے فرائض منصبی میں داخل تھا کہ وہ "اچھوں کی
خوبیوں کو چمکائے، ان کے ہنر اور فضائل عالم میں روشن کرے اور ان کے
اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آئندہ دونوں نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا
سامان مہیا کر جائے"۔ ان کو اس کے نمونے یورپ کی شاعری میں ملے تھے
اس لئے ان کی توجہ مدح کی طرف زیادہ رہی اور دوسرے انداز کے وہ صرف
دو قصیدے پیش کر سکے۔ جہاں تک شاعرانہ محاسن کا تعلق ہے حالی کے
مدحیہ قصیدے کوئی بہت بلند درجہ نہیں رکھتے لیکن انھوں نے مواد اور
ہیئت کے امتزاج سے قصیدہ کو جو ایک نظری آہنگ دینے کی کوشش
کی اس کی اہمیت مسلم ہے۔

اظہر علی فاروقی۔ ایم، اے، ایم، او، ایل

مولانا حالی بحیثیت قصیدہ نگار

مولانا حالی کی قصیدہ نگاری کی نوعیت سمجھنے اور اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں خود ان کا یہ بیان بڑی معاونت کرتا ہے۔ جہاں وہ اُردو قصائد کے متعلق صرف اتنا کہہ کر رک جاتے ہیں کہ ہمارے قصائد کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے۔ وہاں وہ اس کی بابت یہ بھی فرماتے ہیں۔

"قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لئے جائیں اور اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہ ہو۔ بلکہ شاعر کے جوش اور ولولے پر ہو، تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے.....

..... ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعے کو سن کر بے اختیار ہمارے دل میں مدح و ستائش یا نفرت کا جوش اٹھتا ہے۔ کبھی کسی کے عدل و انصاف یا عالی ہمتی یا حب وطن یا قومی ہمدردی یا اور کسی خوبی کو معلوم کرکے اس کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی کسی نیک صفات ستودہ خصائل آدمی کی موت پر افسوس کرنے اور اس کی خوبیاں یاد کرنے کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کبھی ہم کو اپنے گزشتہ دوستوں کی صحبتیں یاد آتی ہیں اور ان کی بے ریا دوستی اور خالص محبت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جو

ان کا ذکر خیر کرنے پر مجبور کرتا ہے ....(مقدمہ شعر و شاعری)

یہ بیان مولانا حالی کے اُن خیالات کو روشنی میں لاتا ہے۔ جو وہ قصیدہ نگاری کی بابت رکھتے تھے یعنی یہ کہ قصیدہ ایک بہترین صنف شاعری ہے اس کا موضوع وسیع ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان محرکات کا اور رجحانات کا بھی ایک سرسری تجزیہ ہو جاتا ہے۔ جو مولانا حالی کے نزدیک قصیدہ گوئی پر اثر [illegible] تے ہیں جنھیں آپ الگ الگ خانوں میں ایک دو۔تین کرکے رکھ سکتے ہیں مذہبی جوش اور عقیدت مندی کا جذبہ قصیدہ گوئی اور قصیدہ خوانی پر ابتدا سے ہی اُبھارتا رہا ہے اور آج بھی اُسے سہارا دے رہا ہے، اس کا ذکر مولانا حالی نے صراحتاً تو نہیں کیا، مگر ضمنی طور پر وہ بھی اس بیان میں آجاتا ہے۔

قصیدے کو ایک اعلا صنف شاعری تصور کرنے کے باوجود ان کے شخصی رجحانات ماحول۔ فضاؤں قصیدوں کی ناگفتہ بہ حالت اور اس سے زیادہ وقت کے تقاضوں نے انھیں اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیئے مثنوی نظم اور مسدّس کا سہارا لینے پر مجبور کیا جس پر روشنی ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے مجموعے میں قصائد کی تعداد دال میں نمک کے برابر بھی نہیں اگر آپ فن اعداد و شمار کا سہارا لیں تو ایک لاکھ اشعار میں اعشاریہ کے ساتھ پانچ یا چھ صفر رکھ کر کہیں ایک کا ہندسہ لگانے کی نوبت آئے جس کا اندازہ آپ اس خاکے سے بخوبی کر سکتے ہیں۔

نمبر شمار	مجموعی تعداد اشعار	تشبیب	گریز	مدح	دعا
(۱) قصیدہ نعتیہ پیغمبر اسلامؐ	۲۳	.....		۳۲	۱

نمبر شمار	مجموعی تعداد اشعار	تشبیب	گریز	مدح	دعا
(۲) قصیدہ نعتیہ پیغمبر اسلام	۷۵	۴۱	۱	۳۰	۳
(۳) " مدحیہ ناتمام نواب رامپور	۲۹	۰۰	۰۰	۲۹	۰۰۰
(۴) " " " سر سید احمد خاں	۱۴	۶	۰۰	۸	۰۰۰
(۵) قطعہ " سر آسمان جاہ بہادر	۲۷	۰۰	۰۰	۲۴	۳
(۶) قصیدہ تہنیتیہ " " "	۴۶	۲۹	۱	۱۲	۴
(۷) قطعہ تہنیتیہ ولادت فرزند نواب سر آسمان جاہ	۱۳	۰۰	۰۰	۸	۵
(۸) " " ولادت فرزند "	۶۵	۹	۱	۴۹	۶ شکریہ
(۹) " سپاسیہ وقار الامراء بہادر	۷	۰۰	۰۰	۷ (شکریہ)	۰
(۱۰) قطعہ سر آسمان جاہ بہادر	۷	۰۰	۰۰	۶	۱
(۱۱) قصیدہ ناتمام " "	۹	۰۰	۰۰	۹	۰۰
(۱۲) قطعہ تہنیتیہ مژدہ قدم شاہزادہ ...	۵	۰۰	۰	۵	۰۰
(۱۳) مسدس مدحیہ سر جیمس ٹامسن	۱۲ بند (۳۶ شعر)	۰۰	۰	۳۵	۱
(۱۴) اشعار مدحیہ سر ڈینس فٹز پیٹرک	۱۱	–	–	۱۱	–
	۳۷۷	۸۵	۳	۲۹۵	۲۴

تین(۱) ناتمام قصیدے، دو نعتیہ، ایک سپاسیہ، اور ایک تہنیتیہ کل مل کر

(۱) دیوان حالی ممکن ہے کہ کسی دوسرے دیوان میں کچھ اور قصائد ہوں جو مجھے نہ مل سکے ہوں۔

۸ قصیدے، ۵ قطعے، ۱ مسدس، اور ۱۱ مدحیہ اشعار کا نظم نما ایک قصیدہ حالی کی مدحیہ شاعری کی کائنات ہے۔

مولانا حالی کے ان مدحیہ اشعار پر سرسری نظر ڈالنے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قصیدہ نگاری کی کسی تیکنیک یا لوازمے کے پابند نہیں ہیں جن تین قصیدوں میں انھوں نے کچھ پابندی کی بھی ہے۔ وہ بھی برائے نام ہے۔ ایک نعتیہ قصیدہ خطابیہ ہے۔ دوسرے نعتیہ قصیدے میں تشبیب کے اہم اشعار اور ایک تہنیتیہ قصیدے میں ۲۹ اشعار ہیں جب کہ ان دونوں قصیدوں کے مجموعی اشعار بالترتیب صرف ۵۷ اور ۴۶ ہیں اور ابن رشیق اور ابن قدامہ دونوں کے خیال سے تشبیب کے اشعار ۲۵ اور ۱۵ سے زائد نہ ہونا چاہیئے۔ اس لیئے کہ وہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تشبیب کے اشعار اصل موضوع سے کسی طرح زیادہ نہ ہوں گویا ان کا وہی خیال ہے جو ڈاکٹر بلیر (Dr. BLAIR) نے مضمون نگاری کی تمہید کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔

"کسی معمولی عمارت کے لیئے ایک بڑا عالی شان پھاٹک کھڑا کر دینے سے زیادہ بد نما کوئی دوسری چیز نہ ہوگی"

اس معاملے میں مولانا حالی ہی نے اختلاف نہیں کیا ہے، بلکہ مرزا سودا کے یہاں بھی اس خلاف ورزی کی مثالیں ملتی ہیں۔ سودا کے ایک مشہور قصیدے میں تشبیب کے ۶۲ اشعار ہیں جب کہ پورا قصیدہ صرف ۱۲۰ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع ہے۔

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک

دی وہیں آکے خوشی نے در دل پر دستک

مولانا حالی کی تین تشبیبوں میں ایک فخریہ ہے جس کے بارے میں خود ان کا ایک نوٹ ملاحظہ ہو۔ جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اُس فخر و مباہات کی نوعیت کیا ہے۔

اس قصیدے کی تمہید ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء کے ہیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ان ہی دنوں میں سیتا رام کی بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں۔ جن دوستوں کی داد بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے شاعرے میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی، جیسا کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے، جن کو سچ مچ اپنے شعر کا قدرداں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا لہٰذا قصیدے کا خاتمہ معتبہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وسیلہ پیدا ہو جائے (دیوان حالی صفحہ ۱۳۰)

اردو قصائد میں فخریہ تشبیبوں کی بہتات ہے سودا اور ذوق تو اپنی ربانی اپنے علم و فضل اور اپنے کمال پر بے تکان فخر کرتے چلے جاتے ہیں مولانا حالی

تو اپنے حسن طبع پر صرف ایک آدھ بار مغرور بن سکے اتنا ہی کہہ سکے۔

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور — مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ — مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور
شرح نقطے کی گر کروں تحریر — تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
گر کروں ذکر لذت طاعات — تائب کردوں مذاق فسق و فجور
کاش واں دیکھتے مجھے کہ جہاں — متنبی تھا مادح کافور

اب اس کے سامنے سودا کا فخر ملاحظہ فرمائیے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو — اللہ ہی اللہ ہے کیا نظم بیاں ہے

. . . .

حسن زمین پر میں کروں بیٹھ کے مصرع موزوں
واں بجز سرو ہے روئیدگی گل محال
جو زباندان تتبع ہو زباں کا میری
پیرو ہونے کی نصیحت کو نہیں اس سے مجال
خامہ کہتا ہے مرا ہے جو فصاحت اک جبر
سو زباں کی ہے مری خادمہ بے رد و مال

مولانا حالی فخر بھی کرتے ہیں تو بھی انھیں واقعیت کا احساس اتنا شدید مبالغہ کرنے نہیں دیتا جو قصیدہ نگاری کی روح سمجھا جاتا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی فخریہ تشبیب میں وہ بہار پیدا نہ ہو سکی جو

دوسرے قصیدہ نگاروں کے وہاں ہے۔

فخریہ تشبیب کے ساتھ عالیہ کی آمیزش قصیدہ نگاری کی رسومات پارینہ سے خلاف ورزی تو نہیں کہی جا سکتی اس لئے سوداؔ کے وہاں اس قسم کا امتزاج پایا جاتا ہے مولانا حالی نے اس تشبیب کو آگے چل کر حالیہ بنا دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

درد دل کا بیاں کروں کس سے ۔۔۔ بات کھوئی نہیں مجھے منظور
سخن حق کی داد لوں کس سے ۔۔۔ سن چکا ہوں فسانۂ منصور
ہم نے دیکھی تمیز اہل نظر ۔۔۔ ہم نے دیکھا مذاق اہل شعور
ہے نغمے ان کو صورت موزوں ۔۔۔ نالۂ دل ہو یا نوائے طیور

... .

ہوں تماشائے شہر نابینا ۔۔۔ ہے برابر مرا خفا و ظہور
دُر یکتا ہوں اور ہوں بے آب ۔۔۔ ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور

اس کے مقابلہ میں سوداؔ کے لفظوں میں ان کی محرومی کا حال دیکھئے۔

تمہیں زمانے کا شبنم سے بھی رہے محروم
اگر نہ روئے مرے روزگار پر شب تار

کروں ہوں تیر میں دندان اشتہا ہر صبح
زمانہ سنگ ملامت سے توڑتا ہے نہار

عجب نہیں ہے زجاجی رہی ہو دنیا سے
بس نوتی سے مرے دل سے اب کیا ہے انار

زمانہ دل کو مرے اور عہد یار کو اب
شکست سے نہیں دیتا ہے ایک آن قرار
کہاں تلک وہ کرے روزگار کا شکوہ
کہ جس کے بخت کی سوگند کھائے ہے ادبار

اور ذوق کی تو یہ حالت ہے کہ

میں عکس اپنا دوں تو موجہ سرے آئینہ
جوں دام موج و شکل خط بوریا گرہ
رجعت سے تخم کی مری ہو گئی بہار
خرچنگ ل کے بیٹھ رہے ایک جا گرہ

عربی قصیدے کے مانند اردو میں ایسی فخریہ تشبیبوں کا فقدان ہے جو رجز کے ہم پلہ ہوں۔ اپنی قوم کی شجاعت، رعب اور ہیبت، علم و فن کی قدر افزائی شرافت اور نجابت وغیرہ پر فخر کر کے قاری یا سامع کی رگ رگ میں بجلیاں بھرنا، اس کے پژمردہ جذبات میں شگفتگی اور برانگیختگی پیدا کر دینا رجزیہ تشبیبوں کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مولانا حالی یہ اثر اپنے قصیدوں اور مدحیہ قطعات میں تو پیدا نہ کر سکے البتہ اپنے مسدس میں رجزیہ تشبیب سے کہیں بڑھ کر یہ اثر پیدا کیا ہے اور وہ ایسا کرتے بھی کس طرح کر سکتے تھے جبکہ وہ ایسی چیزوں کو بدیہات سے تعبیر کر چکے ہوں۔

حالیہ تشبیب میں بھی مولانا حالی وہ گیرائی پیدا نہ کر سکے جو منیر شکوہ آبادی نے "فریاد رہائی" اور امان اللہ سحر لکھنوی نے اپنے شہر آشوب میں پیدا کی۔

چند شعر پڑھیے آپ کو خود اندازہ ہو جائیگا۔

بگڑنا بھی ہے، بننا بھی ہے ہر دم اپنی قسمت میں
مگر ہے تختۂ مشق طفل مکتب لوح پیشانی
چنے کھانے کو ترستے ہیں صاحبان گوہر عالی
صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابر نیسانی

(منیر شکوہ آبادی)

. . . .

گردش چرخ سے ابتر ہے زمانے کا حال
دردناک ہیں ہستی سے نجوم اقبال
نیستی پھیلی ہے اب شہر میں کنگالوں کی طرح
لوگ واقف نہیں دینے سے بجز حرف سوال
دینے والا نہیں ملتا کوئی اب زندوں میں
جمع ہیں قبر یہ حاتم کے ہزاروں کنگال

(سحر لکھنوی)

مولانا حالی کی دوسری تشبیب آپ بہاریہ کے ضمن میں رکھ سکتے ہیں عید کی خوشیوں اور سرمستیوں، ماہ صیام ختم ہونے پر بادہ، ساقی اور جام کا دور دورہ، بادہ خواروں کی مدہوشیاں لوگوں کا فرط انبساط سے پھولے نہ سمانا وغیرہ وغیرہ کا بیان ہے مولانا حالی دو۔ تین اتنا کہہ سکے۔

مہ صیام گیا اور روز عید آیا   خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

رہین منت ساقی ہیں بادہ خوار تمام کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا
مگر سوداؔ عید کی خوشی کا ڈنکا اس طرح بجواتے ہیں۔

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرہ عام
حلال دختر رز بے نکاح، روزہ حرام

پھرا ہے آج بمقصود بادہ خواران چرخ
ہے اب بروئے زمین دور، دور ساقی و جام

مولانا حالیؔ بہور کی مسرت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

شگفتہ آتے ہیں اس طرح عیدگاہ سے لوگ
کہ گنج انھوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا

ع: یہ دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا۔

جب کہ سوداؔ عید کی خوشی میں ایسے متوالے ہو جاتے ہیں کہ منہیات
کو مباحات قرار دیدیتے ہیں۔

بعشق گاہ جہاں جوش ہو خرمی سے آج
کیئے بدل بمباحت مناہی کے احکام

یہاں تک کہ۔

سرور ہے یہ جہاں میں کہ شیخ و زاہد و رند
بہ ترہات و ظرافت بہم کریں ہیں کلام

معانقہ یہاں آج ہے پرستوں کی
کرے ہے محتسب آکر بانبساط تمام

اسی خوشی کے سلسلے میں مولانا حالی اور سودا دونوں نے ایک مضمون باندھا ہے کہ بچوں کو مکتب سے چھٹی مل جانے پر بے پناہ خوشی ہوتی ہے، وہی حال عید کی تقریب پر عوام کا ہے۔ مولانا حالی نے یہ مضمون صرف ایک تشبیہ سے ادا کیا ہے جو اپنی جگہ پر بڑی پیاری ہے لیکن سودا نے ذرا سا اطناب پیدا کر کے اس چیز کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا (حالی)

....

یوں آج ہیں بہم اطفال، دیکھے ہے ملّا
کہ جیوں رعایا یہ عامل نفیر کا احکام
نہ ول ہیں یاد سبق ہے نہ خرد اخوند
بہم ہر ایک ہے مشغول بہت اقسام (سودا)

مولانا حالی اپنے ماحول اور تقاضائے وقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس بہاریہ کو نصیحت کی طرف موڑ دیتے ہیں اور بڑے دانشمندانہ پیرائے میں قاری کو متنبہ کرتے ہیں کہ سچی مسرت اور حقیقی شادمانی یہ نہیں ہے بلکہ

خوشی ہے جس سے عبادت وہ ہے خوشی انکی
جنھوں نے خلق میں ذکر جمیل پھیلایا
جنھوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص
جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا
خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا
نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

ایک اور قصیدے میں ۹ ابتدائیہ اشعار ہیں جو ۱۸۹۱ء میں بمقام حیدرآباد اس وقت لکھا گیا جب ڈاکٹر سر سید احمد خاں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کی طرف سے اپنے رفقاء اور ہمکاروں کا ایک وفد لے کر حضور سرکار نظام تشریف لے گئے۔ ان میں سے ایک بلند شخصیت مولانا حالی کی بھی تھی چنانچہ یہ قصیدہ ایک جلسے میں پڑھا گیا جس کے صدر جناب نواب اقتدار الملک وقار الامرا بہادر تھے۔ اس قصیدے پر نظم کی پرچھائیں ہے۔ ابتدائیہ اشعار جنھیں تمہید کہہ لیا جائے تو بے جا نہیں، ورنہ یہ اشعار بھی حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کے محاسن میں ہیں اور ان پر تشبیب کی کوئی تیکنک منطبق نہیں کی جا سکتی اور پہلا شعر تو قصیدے کو بالکل خطابیہ بنا دیتا ہے۔

اے صغر کی دوسری روز دو شنبہ مرحبا ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبح جانفزا

معانقہ پہاں آج ہے پر ستوں کی
کرے ہے محتسب آکر با نبساط تمام

سی خوشی کے سلسلے میں مولانا حالی اور سودا دونوں نے ایک مضمون باندھا ہے کہ بچوں کو مکتب سے چھٹی مل جانے پر بے پناہ خوشی ہوتی ہے، وہی حال عید کی تقریب پر عوام کا ہے۔ مولانا حالی نے یہ مضمون صرف ایک تشبیہ سے ادا کیا ہے جو اپنی جگہ پر بڑی پیاری ہے لیکن سودا نے ذرا سا اطناب پیدا کر کے اس چیز کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا (حالی)

....

یوں آج ہیں باہم اطفال، دیکھے ہے مُلّا
کہ جیوں رعایا یہ عامل نفیہ کا احکام
نہ ول ہیں یاد سبق ہے نہ ترو اخوند
بہم ہر ایک ہے مشغول بہت اقسام (سودا)

مولانا حالی اپنے ماحول اور تقاضائے وقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس بہار یہ کو نصیحت کی طرف موڑ دیتے ہیں اور بڑے دانشمندانہ پیرائے میں قاری کو متنبہ کرتے ہیں کہ سچی مسرت اور حقیقی شادمانی یہ نہیں ہے بلکہ

خوشی ہے جس سے عبادت وہ ہے خوشی انکی
جنھوں نے خلق میں ذکر جمیل پھیلایا
جنھوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص
جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا
خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا
نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

ایک اور قصیدے میں ۱۹ ابتدائیہ اشعار ہیں جو ۱۸۹۱ء میں بمقام حیدرآباد اس وقت لکھا گیا جب ڈاکٹر سرسید احمد خاں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی طرف سے اپنے رفقاء اور ہمکاروں کا ایک وفد لے کر حضور سرکار نظام تشریف لے گئے۔ ان میں سے ایک بلند شخصیت مولانا حالی کی بھی تھی چنانچہ یہ قصیدہ ایک جلسے میں پڑھا گیا جس کے صدر جناب نواب اقتدار الملک وقار الامرا بہادر تھے۔ اس قصیدے پر نظم کی پرچھائیں ہے۔ ابتدائیہ اشعار جنھیں تمہید کہہ لیا جائے تو بے جا نہیں اور یہ اشعار بھی حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کے محاسن میں ہیں اور ان پر تشبیب کی کوئی تکنیک منطبق نہیں کی جا سکتی اور پہلا شعر تو قصیدے کو بالکل خطابیہ بنا دیتا ہے۔

اے صفر کی دوسری روز دوشنبہ مرحبا — ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبح جانفزا

ہم نے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا
بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں دربدر دیتے صدا
پہنچے لینے ان کو وہ اعیان دارالملک سے
دولت عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

گریز کے معاملے میں مولانا حالیؔ متنبّیؔ سے بیشتر عرب شعرا کی روش اختیار کرتے ہیں یعنی نہ اس میں کوئی حسن اور عجوبگی پیدا کرتے ہیں اور نہ ایسا کرتے ہیں کہ تشبیب کے اشعار کے بعد قاری کو ابہام کی بھول بھلیوں میں ڈالتے اور نکالتے گریز پر آجائیں وہ براہ راست تمہیدیہ اشعار کہتے کہتے یک بیک مدح پر آجاتے ہیں۔ اسی قصیدے میں اہل حیدرآباد کی وضعداری اور خاطر تواضع کا ذکر کرتے کرتے نواب اقتدار الملک وقار الامرا کی مدح اس طرح شروع کر دیتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر کوئی بار نہیں پڑتا اور نہ اُسے کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سنتے تھے نام — آکے یاں سمجھے کہ مہماں نوازی چیز کیا
کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت — اس نے کلفت کو سفر کی دل سے بالکل دھو دیا

یہی حال عتبیہ قصیدے کی گریز کا ہے۔

کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ — لے کے آؤں نوید عفو قصور
لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام — گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

مولانا حالی نے نعت لکھی اور سپاس گزاری کے طور پر مدح کی
حالی کے وہاں نعت کی عام روش سے الگ کوئی ترقی یافتہ اور ممتاز
موڑ تو نہیں ملتا، مگر یہ بات بھی نہیں کہ قصیدے پر میلادیت، غالب
آگئی ہو اور اخلاق و سیر زلف و کاکل کے پھندوں میں پھنس کر رہ گئے
ہوں جیسا عام نعت خواں کیا کرتے ہیں۔

کس کی کاکل کے تصور میں پریشاں ہوں میں
کون آئینہ رخ پہ ہوں میں حیراں ہمہ تن

شمس وصفِ رخ دلبین ہے وصفِ دنداں
والضحیٰ وصف جبیں نور ہے وصفِ گردن

کاکل اس آیتِ رحمت کی جو ہو مشک افشاں
کیا عجب دل ہو مرا نافۂ آہوئے ختن

بلکہ وہ بڑے پاکیزہ انداز میں اس طرح لکھتے ہیں کہ قاری محظوظ بھی ہو اور
سمجھ بھی جائے۔

وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں ... عداوت اس کی عذاب الیم جاں کیلئے
وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام ... محبت اس کی حصارِ حصین اماں کیلئے
گھر اس کا مورد قرآں و مہبط جبریل ... در اس کا کعبۂ مقصود انس و جاں کیلئے
سپہر گرمِ طواف اس کی بارگاہ کے گرد ... زمین سر بسجود اس کے آستاں کیلئے

....

لب شیریں کلام سے اس کے ... دوست بھی شاد غیر بھی مسرور

اثر فیض عام سے اس کے کعبہ آباد بتکدہ معمور

نعت نگاروں کی ایک عام روش یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کی مدح کرتے وقت دوسرے انبیاؑ پر ان کو فوقیت دیتے ہیں اور انھیں برتر سمجھ کر دوسرے انبیاؑ کی کمتری کا مضمون باندھتے ہیں۔ حالی بھی اس جذبے سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اسی تصرف کے طلبگار تھے کلیم و مسیح
نوید امت پیغمبر زماں کے لیے

اتنی بات ضرور ہے کہ مولانا حالی نے اپنی نعت کو مذہبی تعلیمات اور عقائد، قرآنی آیات اور احادیث، تصوف اور فلسفے کی اصلاحات وغیرہ سے عام نعت نگاروں کے مثل بوجھل نہیں بنایا اگرچہ اخلاق و سیر تبلیغ اور تلقین وغیرہ کے پہلوؤں کو بھی کوئی خاص مقام نہیں دیا۔

مولانا حالی کے دوسرے ممدوحین میں سرسید احمد خاں بہادر، سر آسماں جاہ بہادر اقتدار الملک، وقار الامرا، نواب کلب علی خاں بہادر والئ رامپور اور دو تین انگریز حکام ہیں اور ان سب کی مدح مولانا حالی نے اسی جذبے کے تحت کی ہے جس کا ذکر وہ مقدمہ شعر و شاعری میں کر چکے کہ کبھی کسی کے عدل و انصاف یا عالی ہمتی یا قومی ہمدردی . . "کو دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا ہے کہ اس کی ستائش کی جائے۔ مولانا حالی نے ان کے امور خیر خدمت خلق، قومی ہمدردی اور کرم فرمائیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر سپاس گزاری کا فریضہ مدحیہ اشعار کی صورت میں ادا

کیا ہے۔ جن کی شخصیتیں یقینی طور پر لائق ستایش تھیں۔

مولانا حالی کسی وقت بھی اپنے قاری کے ذہن پر نہ تو مبالغے کا بار لادنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اسے استعارات کی پیچیدگی سے گزارتے ہیں۔ اور نہ ایہام اور توریہ کی بھول بھلیوں میں لیجاتے ہیں اور نہ عجیب غریب تشبیہات کے نمونے جھنکاتے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں نہایت صاف سیدھے اور پاکیزہ پیرایے میں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر کہیں قصیدہ نگاروں کی کوئی پکچر گیلری ہو اور کوئی رہنما یا ترجمان یا نگاہ ایک مخصوص تصویر کی طرف اشارہ کرکے آپ کو بتائے کہ یہ مولانا حالی ہیں تو آپ ہرگز ہرگز باور نہ کیجئے اور وہ ہرگز مولانا حالی نہ ہوں گے۔ بلکہ ان کا سیکٹ ہوگا وہ بھی ڈھونڈا سا۔ انھیں آپ مسدس نگار نظم گو شعرا کی گیلری میں دیکھئے جہاں ان کی پاکیزہ اور بلند شخصیت کسی رہنمائی کے بغیر خود بول اٹھے گی۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔)

حالی اور رباعیات

حالی کی رباعیات کا مطالعہ ہم کو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اگر کوئی مؤرخ اس دور کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ ترتیب دے تو اس کو حالی کے کلام اور ان کی رباعیات سے کافی مدد ملے گی حالی کی رباعیات اس دور کی پیداوار ہیں جب ہندوستان اپنی قدیم روایات کو پس پشت ڈال کر ایک نئے ماحول سے روشناس ہو رہا تھا۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن پر مغربی کلچر غالب آ رہا تھا۔ انگریزی تعلیم مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ کر رہی تھی۔ قدیم گھرانے تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ ان گھرانوں کے افراد کاہلی اور سستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور خاندان پر ایک بار ثابت ہو رہے تھے۔ حالی نے ماحول کے اس مدوجزر کا مطالعہ بغور کیا اور اس سے بڑی حد تک متاثر ہوئے

الغرض حالی کی رباعیات اس دور کی یادگار ہیں جب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا ان کی رباعیات ہی میں انقلاب روزگار کے قدموں کی آہٹ صاف طور سے سنائی دیتی ہے۔ ان کی رباعیات میں قوم کراہتی ہوئی اور سسکیاں

لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے حالی کی رباعیات قوم کا مرثیہ ہیں۔
حالی کی رباعیات کو صرف قوم کا مرثیہ ہی نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ قوم کے لئے پیغام بھی ہیں۔ ان کی رباعیات میں ہر جگہ اصلاحی پہلو نمایاں رہتا ہے۔ انھوں نے قوم کی پست حالت کو ابھارنے کی کوشش کی نوجوان طبقہ کو تحریک وعمل کی ترغیب دی۔ ان کو تحصیل علم کے لئے آمادہ کیا۔ گداگری کے پیشے کی مذمت کی۔ ہندو مسلم اتحاد کی نبیاد ڈالی۔ نوجوانوں کو بازاری عشق کے مضراترات سے آگاہ کیا۔ ان کو محنت ومشقت کی طرف مائل کیا اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا درس دیا اس طرح سے حالی نے اپنی رباعیات کے ذریعہ سے قوم کے عیوب کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اسی بنا پر مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی نے حالی کو "رباعیات حالی" کے دیباچہ میں اٹلی کے نامور وطن پرست شاعر کاروڈشی سے نسبت دی ہے[1] اور لکھا ہے کہ کاروڈشی کی زندگی ملک کی لٹریری زندگی تھی۔ اس نے اٹلی کی خدمت کیلئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ اس نے ملک کے پردۂ غفلت کو چاک کیا اور سرزمین وطن کے ذرے ذرے کو منور کر دیا۔ اس نے چرچ کی پست حالت پر حملہ کیا اور تقلید وقدامت پرستی کا مضحکہ اڑایا۔ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی نے یہی تمام خوبیاں حالی میں بھی بتائی ہیں۔ حالی کی زندگی بھی ہندوستان کی

---

[1] رباعیات حالی، مولانا حالی کی تازہ رباعیاں، از مولانا سید وحیدالدین سلیم پانی پتی مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء۔

لٹریری زندگی تھی۔ اور انھوں نے بھی کاردوشی کی طرح ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

حالی کی رباعیات کے اصلاحی پہلو کو مشیر علی قدوائی نے بھی "ادبی مقالات" میں واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حالی کی بعض رباعیات عوام میں مقبول ہیں۔ اکثر رباعیات اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اور بعض پر تو پند و وعظ کا دھوکا ہو جاتا ہے"[1]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی کی بعض رباعیات پر پند و وعظ کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں قوم کی فلاح و بہبود کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنے پیغام کو اپنے طرز بیان پر ترجیح دیتے تھے۔ دراصل حالی پیغمبر پہلے تھے اور شاعر بعد میں۔

حالی کی اس پیغمبری کی طرف ڈاکٹر عابد حسین نے بھی اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی اکبر اور حالی کے نظریات کا فرق بھی بتایا ہے۔ یہی فرق حالی اور اکبر کی رباعیات پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ دو ادیبوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی مایوسی کو توڑا۔ ایک حالی نے "سوز دروں کے لہجہ میں ملت اسلامی کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گزشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی دوسرے اکبر

---

[1] ادبی مقالات۔ از مشیر علی قدوائی ص ۱۳۔ مطبوعہ شاہ اینڈ کمپنی۔ آگرہ ۱۹۴۳ء۔

جس نے ظرافت کے پیرایے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کرایا حالی جدت پسند تھے۔ قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اکبر قدامت پسند تھے۔ نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے۔ مگر دونوں نے مسلمانوں میں غیرت قومی کے جذبے کو ابھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دیا۔ اور یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی۔[۱]

ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کے کلام کی جو خصوصیات بیان کی ہیں انکی جھلک صاف طور پر ان کی رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے اور ان کا سوز دروں اور ان کے دل کی تپش ان کی بہت سی رباعیات میں ملتی ہے۔ اسی لیے ان کی رباعیات قوم کا مرثیہ معلوم ہوتی ہیں مثلاً حالی نے ایک رباعی میں کاہلی اور سستی کی مذمت کی کیونکہ یہ بری عادتیں گھرانے کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔

آباد کو زمین و ملک پر اطمینان اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بیکار جوان ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہماں

انھوں نے عیش و عشرت کو قوم کے لیے مضرت رساں بتایا۔

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

---

[۱] اقبال کا تصور خودی۔ از ڈاکٹر عابد حسین صفحہ ۵۔ مطبوعہ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۴۲ء۔

اسی عیش و عشرت نے نینوا ۔ بابل ۔ بغداد اور قرطبہ جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو تباہ کر دیا۔

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا	سلطاں کو گدا، غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل	بغداد و قرطبہ کو تاراج کیا

حالی نے اسی وجہ سے عشق کو بھی معیوب بتایا کیونکہ اس سے گھرانوں میں گھن لگ جاتا ہے ۔

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ	پیروں کو خرفت اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری	قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

حالی نے گداگری کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی ۔

اک مرد توانا کو جو سائل پایا	کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا ان کی گردن پہ وبال	دیدے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

مندرجہ بالا حالی کی رباعیات اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں۔ اس زمانہ کے افراد جن خرابیوں میں مبتلا تھے، ان کی عکاسی حالی نے اپنی رباعیات میں کی ہے ۔ اور اس طرح سے مریض کو اس کے مرض سے آگاہ کیا ہے ۔ ساتھ ہی حالی نے ایک ہمدرد معالج کی حیثیت سے مرض کے لئے علاج بھی تجویز کیا ہے ۔ انھوں نے ان تمام امراض کو دور کرنے کے لئے تحصیل علم پر زور دیا ہے ۔

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال	غائب ہوا تو جہاں سے، وہاں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح	جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

اس کے علاوہ حالی نے قوم کی ترقی کے لئے نوجوانوں کو محنت و مشقت کرنے کی بھی تلقین کی۔

محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
جب تک کہ نہ چرائیں بکریاں مدین میں موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی

حالی کی مندرجہ ذیل رباعی ڈگمگاتی ہوئی قوم کے لئے ایک عصا کا کام کرتی ہے۔

دیکھا تو چڑھا دانے کو لیکر سو بار تیمور نے اک مورچہ زیر دیوار
مشکل نہیں کوئی یہ تیں ہمت دشوار آخر سر بام لیکے پہنچا تو کہا

حالی کی یہی شاعری پیغمبری کے ہم پلہ ہے۔ ان کی اسی شاعری نے قوم کے مردہ جسم میں روح پھونک دی۔ دراصل حالی کی یہی مسیحائی ان کی حیات ابدی کی ضامن ہے۔

حالی نے سماج کی اصلاح کے علاوہ مذہب کی بھی اصلاح کی۔ ان کے عہد میں نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور انگریزی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر اسلامی اصولوں سے ناواقف ہوتا جا رہا تھا۔ اسی ناواقفیت کی بنا پر ایک طبقہ خدا کے وجود سے بھی انکار کرتا تھا۔ وہ طبقہ تخلیق کائنات کا سبب نیچر کو تسلیم کرتا تھا۔ حالی نے جوش عقیدت میں آکر ان نیچریوں اور دہریوں پر ایک ضرب کاری لگائی۔ ان کی دو رباعیات ملاحظہ ہوں۔

آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
انکار کسی سے نہ بن آیا تیرا دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا   حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور   بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

حالی کو نیچریوں کے علاوہ مولویوں اور زاہدوں پر بھی وار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان میں بھی پختگیٔ ایمان کی کمی تھی۔

زاہد کہتا تھا جاں ہے دین پر قرباں   پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح   فرمایا بھائی جان! جی ہے تو جہاں"

ایران میں سعدیؒ کو صوفیوں کی نیت پر شبہ ہوا تھا

محتسب در قفائے رنداں است   غافل از صوفیانِ شاہد باز

اور ہندوستان میں حالی کو ان کی نیت میں فتور نظر آیا۔

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں   نیکی میں شک اس کے کوئی لایا ہی نہیں
ہے سکہ رائج میں بھی اس کے کوئی کھوٹ   پر اس کو کسی نے تپایا ہی نہیں

حالی کو واعظ کے وعظ میں بھی خامی نظر آئی۔ انھوں نے اس کو درشتی کلام سے باز آنے کی تلقین کی۔

اک گبر نے پوچھے جو اصول اسلام   واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے   ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

حالی نے یہ بھی محسوس کیا کہ مسلمانوں میں باہمی نفاق ہے۔ اور یہ باہمی نفاق اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ ہے۔

کہتا تھا کل اک منکر قرآن و خبر   کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ   کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

اسی باہمی نفاق کی طرف ایک اور بھی رباعی میں اشارہ کیا ہے مگر اس کا لب و لہجہ پہلی رباعی سے زیادہ طنزیہ ہے۔

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخوان لپکا — ہونا نہیں مومن کا اب ایمان پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے — سنتے ہیں کسی کو جب مسلمان لپکا

حالی کی مندرجہ بالا رباعیاں اس دور کے مسلمانوں کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ حالی کے لب و لہجہ میں خلوص بھی ہے اور طنز بھی مگر جو کچھ ہے صداقت پر مبنی ہے۔ حالی کی رباعیات کے آئینہ میں اسلام کے اصل خد و خال نظر آتے ہیں۔ ان کی دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان — برسات میں سبزے کا نہ تھا جس میں نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقاں — یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

حالی نے اسلام کی تنزلی کو ایک چٹیل میدان سے تعبیر کر کے مسلمانوں پر ایک زبردست طنزیہ وار کیا۔ اور یہی وار مسلمانوں کو بیدار کرنے کیلئے کافی ہے اسی وار نے ان کو خواب گراں سے چونکایا اور ابھرتی ہوئی صبح کے جلووں سے ہم کنار کیا۔

حالی کی اصلاح کا ایک وہ بھی پہلو ہے جو ان کی سیاسی رباعیات میں جلوہ گر ہے ان رباعیات سے اس دور کی سیاسی حالت پر روشنی پڑتی ہے

مثلاً ہم کو ان کی ایک رباعی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ٹیکس کس قدر سختی سے وصول کیے جاتے تھے ۔ دراصل حالی کے نظریہ کے مطابق اس سختی کو نرمی میں تبدیل کرنے کی ضرورت تھی ۔

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل   اک وقت سے اپنے انہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور   ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

ایک رباعی کے ذریعہ حالی نے مصلح قوم کی اصلاح کی اور اس کو مشورہ دیا کہ اصلاح اسی حد تک بجا ہے جس حد تک اس سے مفید نتائج برآمد ہوں

دھونے کی ہے اے رنا مرجا باقی   کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو یہ اتنا نہ رگڑ   دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

حالی عمال کے اعمال سے بھی نالاں ہیں ۔

ہیں برف سے یخ سے ملک پامال کہیں   طاعون ہے نازل کہیں، بھونچال کہیں
ابتر ہے کچھ ان دنوں نظام عالم   عمال نہ ہوں خلق کے اعمال کہیں

حالی نے جمہوریت کے راز کو مکمل طور پر سمجھا ہے ۔ وہ اس نکتہ سے آگاہ ہیں کہ جمہوری نظام میں مساوات ۔ اتحاد اور اس کی کیا اہمیت ہے ۔ اسی سے وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہندو اور گبر سے لڑنے کے بجائے انکی طرف دست آشتی بڑھانا چاہیئے ۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں   شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا   وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

حالی نے اپنا اصلاحی کام افراد کے اخلاق کو درست کرنے کے سلسلہ میں

بھی جاری رکھا۔ فرد اور جماعت میں جو گہرا تعلق ہے، حالی اس سے بخوبی واقف ہیں۔ فرد کی اصلاح سے جماعت کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور جب تک فرد کی اصلاح نہیں ہوگی جماعت کی اصلاح میں دشواریاں پیش آئینگی اسی سے انھوں نے افراد پر اس بات کا زور دیا کہ وہ عیوب سے بچنے کی کوشش کریں ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور — پر عیب سے بچئے تا بہ مقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو — گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

تاہم وہ انسانی کمزوریوں سے بھی واقف ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر کسی انسان میں تمام نیکیاں ہوں اور چند خرابیاں ہوں تو وہ قابل ملامت نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد اے فرزند — اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں — ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

حالی کی نظر میں سب سے زیادہ بلند ہمت وہ شخص ہے جو بدی کا بدلہ لے سکتا ہو مگر نہ لے۔

پوچھی نے یہ کی عرض کہ اے بار خدا — مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے — جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

دیگر شعرا کی طرح حالی ریاکاری کو معیوب سمجھتے ہیں۔ انھوں نے گندم نما جو فروش لوگوں پر بھرپور وار کیا ہے۔

حالی راہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا

لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر — بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

غرضکہ حالی نے اپنی رباعیات کے ذریعہ عوام کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی۔ اور انھوں نے بڑی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

حالی ایک مصلح کا دل، اور سیاست داں کا دماغ ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک فلسفی کی نظر بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے جب دنیا کے حالات کا جائزہ لیا تو دیگر شعرا کی طرح ان کو بھی دنیا ایک سرائے فانی نظر آئی۔ مگر اس فنائیت کے فلسفہ نے ان کے دل پر یاسیت کے نقوش کندہ نہیں کیے بلکہ ان کو عزم و استقلال کا ایک نیا حوصلہ دیا۔ حالی کے فلسفۂ فنا اور دیگر شعرا کے فلسفۂ فنا میں بھی فرق ہے۔ دیگر شعرا فنا کا پیغام سن کر مایوس ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات نالہ و فریاد برپا کرتے ہیں۔ مثلاً شاد عظیم آبادی فرماتے ہیں۔

جھونکوں سے لپیٹ کے غش ہیں ہر طار آئے — کیفیت یاس شمع سے ظاہر ہے
تم بھی شب غم سے مل کے رو لو اے شاد — آثار سحر بھی ہیں، رات بھی آخر ہے

بے ثباتی دنیا سے اکتا کر بعض شعرا ساغر و سبو کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً اثر صہبائی کہتے ہیں۔

تاریکیٔ اندوہ ہے باقی ساقی — ہاں بادۂ دل فروز ساقی ساقی
یہ رنگ یہ محفلیں رہیں یا نہ رہیں — ہے عہد شباب اتفاقی ساقی

مگر حالی کے فلسفۂ فنا کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ "تاریکیٔ اندوہ" میں گھبرا کر

مایوس نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک نیا پیغام دیتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ جب زندگی چند روزہ ہے تو جتنے کام کرنا ہیں ان کو جلد از جلد ختم کر لینا چاہئیے تاکہ حیات نامکمل نہ رہ سکے۔ حالی کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں جو ان کے نقطہ نظر کو بخوبی واضح کرتی ہیں۔

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

یارو نہیں وقت آرام کا یہ
موقع ہے اخیر، فکر انجام کا یہ
بس حب وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

حالی کے یہاں کچھ ذاتی رباعیاں بھی پائی جاتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے تعلقات اس دور کے امرا اور رؤسا سے کیسے خوش گوار تھے۔ ان رباعیات سے خوشامد یا قصیدہ گوئی کی ذہنیت کا اظہار نہیں ہوتا ہے بلکہ ان سے خلوص محبت اور یگانگت ٹپکتی ہے۔ اور یہی حالی کا پیام بھی تھا انھوں نے ساری زندگی انسان، قوم اور ملک کی اصلاح میں صرف کر دی اور ہر طور سے انسانی معیار کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دو ذاتی رباعیاں

بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

نواب وقار الامراء اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اس کی چھوڑ دی ہمراہی ۔۔۔ اقبال پہ جس نے فتح پائی چاہی
حالی لے جائے گا کون بازی ان سے ۔۔۔ ہے جن کی رگوں میں خون آصف جاہی

نواب محسن الدولہ محسن الملک بہادر کی شان میں

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا ۔۔۔ خدمت کے لیے قوم کی مر مر کے جیا
پیری ہوئی سدراہ اس کی نہ مرض ۔۔۔ صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

حالی کی رباعیات ان کے زمانے ہی میں مقبول ہو گئی تھیں۔ اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لیے "مقام حیات" حاصل کر لیا تھا۔ اس مقبولیت کے دو اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ حالی نے وقت کی آواز کو پہچانا اور اسی سُر میں اپنے نغمے گائے انھوں نے اپنے سماج کی مکمل طور سے عکاسی کی۔ اس لیے عوام کو ان کی بات میں اپنی بات نظر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے دیگر شعرا اس قدر مقبول نہ ہو سکے اور ان کو حیات ابدی کے وہ مدارج حاصل نہ ہو سکے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے "تنقیدی اشارے" میں حالی کی ادبی کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"حالی نے ہوش سنبھالا، تو ہمارا ادب ایک خاص منزل پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ شاعری چونکہ آزاد کے الفاظ میں فارسی کے پروں سے اڑی تھی، اس لیے

اس میں ایسی ہی باتیں آ گئی تھیں جس ماں کا اس نے دودھ پیا تھا، اس کی خاصیت پیدا ہو چلی تھی۔ روشنی تھی، گرمی نہ تھی، حسن تھا، تندرستی نہ تھی، بلند آہنگ نغمے تھے مگر ان میں تاثیر ناپید تھی۔[1]

حالی کا کلام اس وجہ سے پسند کیا گیا کہ اس میں گرمی بھی تھی، تندرستی بھی تھی اور تاثیر بھی تھی۔ اور یہی گرمی، تندرستی اور تاثیر ان کی رباعیات میں بھی موجود ہے۔ اسی لیے ان کی رباعیات دیگر رباعی گو شعرا کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوئیں۔

حالی کی رباعیات کی مقبولیت کا دوسرا سبب ان کا طرزِ بیان ہے جو نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ طنزیہ بھی ہے جو دل پر تیر کی طرح پیوست ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حالی کے تیر اکبر کے طنزیہ تیروں کی طرح "گمبھیر گھاؤ" نہیں کرتے ہیں تاہم ان کی چبھن اور تیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس طنزیہ انداز سے انھوں نے سماجی سیاسی اور اخلاقی اصلاح کا کام لیا جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔

حالی کی رباعیات کا خوش گوار اثر دیگر شعرا پر بھی پڑا۔ خاص طور سے اقبال کے کلام میں حالی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اقبال مقصدیت اور افادیت کے نقطۂ نظر سے حالی سے بہت قریب ہیں۔ حالی کی کامیابی کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے۔

---

[1] تنقیدی اشارے۔ پروفیسر آل احمد سرور ص ۸۳، ۸۴

ڈاکٹر محمد عقیل

حالی کی مثنویاں

تغیر، مادیت، تاریخی مادی جدلیت کا مبہم تصور، حقیقت پسندی، وطنیت کا جذبہ جو کہیں تیز اور کہیں سطحی، سیاسی شعور کی ہلکی سی بیداری، سرمایہ دارانہ ذہنیت سے پیدا شدہ اثرات کے ساتھ سماجی خرابیوں کی اصلاح، شہنشاہیت کے اقتدار کے نیچے ترقی کی خواہش — یہی چند تصورات اور غیر منظم اتفاق تھے جن کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور جسے دورِ جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے، ادب کے تاریخی اسٹیج پر ظاہر ہوا جس کے پیشرؤں میں آزاد، حالی، اسماعیل اور شبلی سب سے آگے تھے۔ یہی وہ پہلا دستہ ہے جس نے ادب اور سماج کے تعلقات کو شعوری طور پر منسلک کرنے کی کوشش کی اور اس کام کے لئے انھوں نے اپنا گروہ اور اپنا ماحول بنانا شروع کیا۔ حالی کی مثنویاں اور نظمیں، مولوی اسماعیل کی بیزاری، سرسید کے تحریری اور تقریری مقالات اسی احساس کی صدائے بازگشت تھے۔ گو اس میں ۲۰ ت ۔۔۔ نقاد کی رنگ آمیزی تھی تاہم ہندوستان کے بعد زدہ طبقے میں ایک گونہ شعوری

ارتقار کی لہر آچلی تھی۔ مادیت پر یقین، جدلیت کا خیال، زندگی کے حرکی ہونیکا تصور، ان پیش رُوں کی رگ وپے میں زور بھر رہا تھا۔ اور ان تمام باتوں کے تجربے شعرا اور ادیب اپنے ادب پاروں میں کرنے لگے تھے۔ ان تجربہ کرنے والوں میں حالی کا نام اور ان کی تخلیقات ایسی اہمیت رکھتی ہیں جنھیں کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یوں تو حالی نے نظم ونثر، ہر چیز پر طبع آزمائی کی مگر اس مقالے میں ہم صرف ان کی مثنویوں سے بحث کریں گے۔

حالی نے جتنی مثنویاں لکھی ہیں، ان میں سے قابل ذکر مثنویاں کل گیارہ ہیں جو ان کے مجموعہ نظم حالی میں علاوہ 'مناجات بیوہ' کے موجود ہیں۔ ان مثنویوں اور ان کے ساتھ کی دوسری نظموں کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ حالی مثنوی کا ڈھانچہ برتنے کے لئے زیادہ کوشاں نہ تھے۔ وہ ڈھانچہ برتنے سے زیادہ اپنی بات کہنے کے خواہاں تھے۔ انھیں جو کرب پریشان کئے تھا وہ ان عقائد اور خیالات کا تھا جن کو اپنا کر وہ اپنے دور کے ساتھ اٹھے تھے اسی لئے حالی کی نظموں اور مثنویوں میں موضوع کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ مثنوی کو انھوں نے بیانیہ شاعری مانا اس کے لئے مقدمہ میں اصولوں کی تدوین کی مگر خود انھوں نے کوئی بڑی مثنوی نہیں لکھی جو عہد آفریں ہوتی یا اس قدر حیثیت رکھتی جو ان سے پہلے کی اکثر مثنویاں رکھتی ہیں اسلئے کہ انکے پاس ایسی عظیم بیانیہ کیلئے کوئی وسیع موضوع نہ تھا اور جو موضوعات تھے وہ اتنے ہنگامی تھے کہ انکی بنیاد زیادہ مضبوطی کے ساتھ بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکتی اور زمانہ ان موضوعات کا زمانہ نہیں تھا جس پر اس سے قبل لوگ طبع آزمائی کر چکے تھے۔

حالی کی دنیا میں ہر چیز اسباب و علل کے پس منظر میں سوچی جانے لگی تھی خیال کا خالق مادہ ہے جس کے بغیر خیال کی بنیاد ہوا پہ رہتی ہے پھر وہ مثنوی کو ایسے ڈھرے پر کیسے لے جاتے جہاں توجیہات کا فقدان ہوتا حالی کو عشقیہ موضوع بھی کچھ زیادہ پسند نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ ایسا راگ تھا جو رٹتے رٹتے اجیرن ہو گیا تھا۔ مقدمہ میں آگے چل کر انھوں نے مثنویوں کے متعلق اظہار خیال بھی کیا۔

"ہماری مثنویوں کا یہ حال ہے کہ ان میں معمولی حمد و نعت وغیرہ کے بعد اکثر پہلے کسی بادشاہ زادہ یا وزیر زادہ یا امیر زادہ یا سوداگر بچہ کے حسن و جمال کی تعریف ہوتی ہے پھر اسکو کسی پری یا شہزادی یا وزیرزادی یا کسی اور کیساتھ لگا مارا جاتا ہے وہ اول اسکے فراق میں شہر شہر اور جنگل جنگل ملا مارا پھرتا ہے پھر آخر کار وصل سے کامیاب ہوتا ہے ... پس ہمارے ہاں وہی مثنویاں رونق پاتی ہیں جن کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہو۔[1]"

گو حالی اس وقت تک حب وطن اور برکھا رت جیسی مثنویاں لکھکر موضوع کا نمونہ بھی پیش کر چکے تھے مگر لوگ ایسے موضوع کی طرف قلم اٹھانا محض تمسخر اور مذاق سمجھتے تھے۔ حالی مثنویوں کی دنیا میں بھی وہی انقلاب لانا چاہتے تھے جیسا کہ تمام اردو شاعری میں اور ان کے نزدیک یہ تکمیل اسی وقت ہوتی جب اردو شعرا بھی نئے موضوعات کو اپناتے اور عشق و عاشقی کے فسانوں کو چھوڑ کر زندگی کے حقائق اور رست بے تعلقات کو اپنا موضوع بناتے جہاں سادگی، اصلیت، اور جوش کو سبقت تو حاصل ہوتی ہی مگر ساتھ ہی ساتھ

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری ص۱۹۱

اس گرتی ہوئی قوم کو افادیت کا بھی پیام ملتا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ان کے ان خیالات کو عملی جامہ کس طرح ملے۔ اس دور کے لوگ افادیت سے اس واسطے گریزاں تھے کہ یہ شعریت، کیف اور دیرپا تاثر کا خون کر دیتی ہے چنانچہ حالی نے اپنے خیال کی تبلیغ کے لئے خود بہت سی مثنویاں برکھارت، حب وطن مناظرہ رحم و انصاف، تعصب و انصاف، کلمۃ الحق بیوٹ اور ایکے کا مناظرہ، دولت اور وقت کا مناظرہ اور نشاط اُمید کے نام سے لکھیں جس میں پُرانے راستوں سے مراجعت تھی اور نئے موضوعات اور طرز فکر کے لئے دعوت۔ ان میں بہت ساری مثنویاں ایسی تھیں جو شاعری کا رخ بدلنے کیلئے لکھی گئی تھیں اور بہت سی ایسی جو مسدس مدوجزر والے موڈ میں مسلمانوں کے معاشی، معاشرتی حالات درست کرنے کی خاطر تصنیف ہوتی تھیں، کچھ ایسی بھی تھیں جو انگریزی شاعری اور مغرب کے اثر سے متاثر تھیں۔ مگر اولیت انھیں کو حاصل تھی جس میں سماجی اور معاشی اصلاح مدنظر تھی۔

۱۸۵۷ء کے نامکمل انقلاب نے جب یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان سیاسی طور پر اب اس قابل نہیں رہا کہ ایک ایسی قوم سے مقابلہ کر سکے جو علم و دانش، فکر و نظر، حکمت و حرفت ہر چیز میں اس سے بہتر ہے اور جب ایسی قوم کے سامنے انھیں طاقتوں اور بہتریوں کے باعث ہندستانیوں کو ہتھیار ڈال دینا پڑا تو ہندوستان کے تقریباً تمام طبقے اپنی اپنی قوموں کا (جو درحقیقت فرقے تھے) اندرونی جائزہ لینے لگے کہ ہم میں ایسی خامیاں آگئی ہیں جن کے باعث اب ہمارا قیام اس قوم کے سامنے ممکن نہیں ہے ساتھ ہی ساتھ

انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ابھی تو ہم سیاسی بساط ہی پر ہارے ہیں مگر یہی حالت اگر ہماری قائم رہی تو شاید، کلچر، ثقافت اور تہذیب کی بساط پر بھی ہماری ہزیمت یقینی ہے چنانچہ ایک معاشی اور معاشرتی اصلاح کی لہر سارے ہندوستان میں دوڑ گئی۔ راجہ رام موہن رائے، سرسیّد سوامی دیانند سرسوتی، سبھوں نے معاشرے کا جائزہ لینا شروع کیا اور کوشش کی کہ اس پرانے نظام کو ایک نئے راستے پر لگایا جائے تاکہ اس معاشرے میں پھر سے جان پڑ جائے۔ حالی بھی اسی تحریک سے متاثر ہوئے چونکہ اس دور میں لوگ قومیت کا بہت محدود نظریہ رکھتے تھے اس لیے حالی نے بھی قومی اصلاح کو محض مسلمانوں کی اصلاح سمجھا چنانچہ اس کی کوشش اپنی مثنویوں اور نظموں کے ذریعہ کرنے لگے۔ 'مناجات بیوہ، تعصب اور انصاف چھوٹ اور ایکے کا مناظرہ اسی تحریک کی کڑیاں ہیں گو کہ ان میں بالتصریح انھوں نے مسلمانوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ ان کی تلخ نوائی کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہو سکتا ہے تعصب اور انصاف، میں انھوں نے مشرقی ذہنیت کا بڑا اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جہاں کے لوگ خود کو ہر حالت میں دوسروں پر فوقیت دیتے ہیں اور حقیقت سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار سے حالی کی جگر سوزی اور ہماری حماقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کی بھی جو انے جہاں عمر بسر   تھے پسندیدہ اسی شان کے گو
کشتی نوح کا جو تھا انداز   اسی انداز کے چلتے تھے جہاز

تھی اسی نسخہ پہ موقوف شفا　　جو تھا بقراط نے ترتیب دیا
ٹوٹ سکتی تھی نہ داں رائے قدیم　　تھا امٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم
اسی عالم میں پلے تھے ہم بھی　　اسی ساون کے تھے اندھے ہم بھی
جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پر　　ختم ہیں سارے کمالات بشر

مگر جب ہم اپنے خول کو توڑ کر باہر آئے۔ اور ایک نئی تہذیب سے روشناس ہوئے تو حقیقت اس کے برعکس نظر آئی۔

دی جب انصاف نے دستک آکر　　جب ذُتنگ سے نکلے باہر
رُخ حقیقت نے دکھایا ہر سو　　چاندنا سا نظر آیا ہر سو

اس تہذیب کی دُنیا میں ہر اچھی چیز کی تعریف ہوتی، اور اسے اپنایا جاتا خواہ وہ کسی کی ہو۔ اگر ایسی چیزیں اور تجربات بہ سید نظر آتے میں تو اسے تبدیل کر کے فوراً ایک معتبر تجربے کو اپنا لیا جاتا اور پھر وہی حرف آخر نہ ہوتا بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی۔

رُت نئی ریت نکلتی تھی وہاں　　رُت، سماں روز بدلتی تھی وہاں
قافلے چلتے تھے دن رات تمام　　کسی منزل پہ نہ کرتے تھے قیام
قبلہ تھا علم الٰہی ان کا　　تھا سفر، نا تمنا ہی ان کا

جہاں دوسری قوموں میں یہ حرکت ملتی وہاں ہم خود اپنے آپ کو ننگا منگا پاتے جس کی ساری ذمہ داری ان لوگوں پر تھی جو قوم کے ناخدا بنتے تھے مگر روز بروز قوم کے بیڑے کو تباہی کے قریب لیئے جاتے تھے جو پیاز کی طرح پرت پرت پوست ہی پوست۔ قوم کے دوست، مگر نادان دوست

حالی تصوف سے نالاں تھے اور تقدیر پرستی سے بھی انھیں عناد تھا۔ خوبی وخرابی، ان کے نزدیک جماعتی کجروی یا نیک روی سے ظہور میں آتی ہے جس کا ذمہ دار ہر وہ فرد ہے جو کسی تنزل آمادہ جماعت کا ممبر ہے۔ اس خوبی وخرابی کو نہ تقدیر سے کوئی علاقہ ہے اور نہ ہر چیز منجانب اللہ ہے بلکہ اس دُنیا میں بہت سے بھگتان ہم اپنی حماقتوں کے باعث بھگتے ہیں۔ ہندوستانی سماج اس سے بیگانہ تو نہیں تھا مگر جس طرح ہر شخص اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے لئے، اپنی نفسیاتی کمزوری کے باعث تیار نہیں ہوتا اسی طرح ہمارا سماج بھی خرابیوں اور سماجی نقائص کو اپنی حماقت کا باعث قرار دینا نہیں چاہتا۔ اسلام میں تقدیر پرستی کا قیام اس وقت ہوتا جب تدبیر کی ساری منزلیں ختم ہوجاتیں۔ رسولؐ نے خود ایک بیوہ کیساتھ نکاح کرکے تمام دنیائے اسلام کو اس بات کا سبق دے دیا تھا کہ عقد بیوگان ضروری ہے مگر مسلمانوں نے بھی ہندوستان میں، رائج شدہ چند غلط رسموں کو اپنالیا اور بیواؤں کے عقد سے بڑی حد تک احتراز کرنے لگے اور بیوگی ان عورتوں کی تقدیر سمجھ لی گئی جو ہماری حماقتوں کا نتیجہ تھی۔ اسی غلط رسم نے ستی کی صورت اختیار کی تھی اور جب اس رسم کا انسداد ہوا اور ہندوستان کے چند مصلحین نے اس وحشیانہ رسم کو رد کئے اور پھر سے بیوؤں کی شادی پر زور دیا تو سماج میں ایک طرح کی ہلچل مچ گئی۔ جو لوگ کھل کر مخالفت کرنا کسی سبب سے مناسب نہ سمجھتے تھے وہ یہ سمجھ کر اپنے گھر بیٹھ گئے کہ جادو ستی نہ ہوگی وہ شادی بھی نہ ہوگی۔ اس ضد کو اسی وقت توڑا جاسکتا تھا جب ایسے لوگوں کے

دلی جذبات کو برانگیختہ کرکے انھیں ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنے کا موقع دیا جائے۔ حالیؔ نے 'مناجات بیوہ' لکھ کر انفعالی طور پر لوگوں کو اس غلط رسم سے متاثر ہونے کا ایسا موقع دیا کہ 'مناجات بیوہ' نہ صرف حالیؔ کی تمام مثنویوں میں بلکہ تمام نظموں میں سب سے زیادہ مؤثر اور بلند مثنوی ہو گئی۔ 'ایک بیوہ کی یہ فریاد بال ودواہ' (کمسنی کی شادی) کی رسم کے خلاف ایسی آواز ہے کہ حساس اور باشعور انسان کے دل میں غم و غصہ کی آگ بھڑکا دیتی ہے۔

میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا　　پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا
بالیاں اک اک ذات کی لاکھوں　　بیاہیاں اک اک رات کی لاکھوں
سیکڑوں بیچاری مظلومیں　　بھولی ناداں اور معصومیں
بیاہ سے انجان اور منگنی سے　　بنے سے واقف اور نہ بنی سے
ماؤں سے جو منہ دھلواتی تھیں　　رو رو مانگ کے جو کھاتی تھیں
ہوش جنھیں تھا رات نہ دن کا　　گڑیوں کا سا بیاہ تھا جن کا
دو دو دن رہ رہ کے سہاگن　　جنم جنم کو ہوئیں برہن
پیت نہ تھی جب پایا پیتم　　جب ہوئی پیت، گنوایا پیتم
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا　　دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہونچانی　　کاٹنی ہے بھرپور جوانی

یہی نہیں اس مثنوی میں حالیؔ نے انسانی زندگی کے بھرپور احساس اور ادراک کو سمونے کی کوشش کی ہے جو بیک وقت خطابت بھی ہے

ر شاعری کا بہترین نمونہ بھی زندگی کی پہنائی اپنا پورا مرقع اس طرح پیش کرتی ہے کہ نشاط و غم دونوں کی تصویریں کامیابی کے ساتھ ابھر آئی ہیں۔

ہنس ہنس دل بہلاؤں کیونکر | اوسوں پیاس بجھاؤں کیونکر
گھر یہ برہ اور پیا بدیسی | آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں | نون کو ترسی میں سانجھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی | سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
رہی اکیلی بھری سبھا میں | پیاسی رہی بھری گنگا میں
چین سے جاگی اور نہ سوئی | میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی
کھایا تو کچھ مزا نہ آیا | سوئی تو کچھ چین نہ پایا
شام کو مردے کا ہے یہ رونا | ساری رات نہیں اب سونا

ہندوستان میں سماجی اصلاح کی یہ کوشش خواہ تقلیدی رہی ہو یا نی سیاسی نار کے باعث ہندوستانی داخلی طور پر اس طرف رجوع ہو گئے ا ہے ولیم بنٹنگ یا ولیم ولبرفورس اور ویلزلی برادرس کے اثرات یہاں ام کرتے رہے ہوں جس کے ماتحت یہ لہر ہندوستان پہنچی جس میں روسو رمان ٹشکی کے خیالات کا خمیر شامل تھا۔ کچھ بھی رہا ہو مگر اس سے انکار ہیں کیا جاسکتا کہ اس کوشش نے ہندوستان کو نئی روشنی کے قریب نے میں بڑی مدد دی۔ حالی، آزاد اور اسماعیل کی ادبی اصلاح بھی اسی کی ب کڑی تھی۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ تحریک، انگریزی ادب میں نئی قدروں کا

احساس، نثر نگاری میں، جانسن، میتھو آرنلڈ اور سوئفٹ کے تجربات سب بڑی تیزی سے ان لوگوں کو متاثر کرنے لگے جو سماج کے ساتھ ساتھ اپنے ادب کو بھی خوب سے خوب تر بنانے کے خواہاں تھے۔ یہ لوگ ایسے تھے جو ادب میں تعصب کو داخل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دوسروں کی خوبیوں اور اپنی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی نظر میں اکبر الہ آبادی کی طرح ہر مغربی چیز قابل سوختنی نہ تھی بلکہ اس کی تمام خوبیوں کو حاصل کرنے میں ہندوستانی ادب اور سماج کی فلاح و بہبود تھی۔ چنانچہ مضامین اور نظموں کے ساتھ ساتھ رومانوی تحریک کی فطرت نگاری پر بھی یہ لوگ فریفتہ ہو گئے۔ اس پسند کی وجہ تو یہ تھی کہ یہ تمام بیانات انگریزی شاعری میں حقیقت نگاری پر مبنی تھے جس کی اردو ادب کو اس وقت بہت ضرورت تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ ہندوستان کی سرزمین اپنے جغرافیائی اعتبار سے ایسی شاعری کی متقاضی تھی جس کی مثالیں، سورداس، تلسی داس کے ساتھ ساتھ اردو کے تمام ممتاز شعراء جن میں دکن سے لے کر، سودا، میر میر حسن وغیرہ سبھی تھے سب کے یہاں مل جاتی تھیں۔ لکھنؤ کے طرز نے جو ایک طرح کی مجہولیت پیدا کر دی تھی جس سے حقیقی شاعری کے تمام سرچشمے ختم ہو چکے تھے۔ اس مجہولیت کو ختم کرنے کا اس سے اچھا اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ اردو شاعری کو نئے رخ سے آشنا کیا جائے اور لوگوں کو ایسی ہی فطرت نگاری اور حقیقت نگاری کے قریب لایا جائے۔ اسکے لئے صحیح میدان، بیانیہ شاعری ہی میں مل سکتا تھا۔ حالی نے چنانچہ اس

رجحان کو اپنی نظموں اور مثنویوں میں سمونا شروع کیا خوش قسمتی سے اس وقت لاہور میں کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد کی کوششوں سے نظموں کے مشاعروں کی بھی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ حالی کی ایسی مثنویاں زیادہ تر وہیں لکھی گئیں ان کی برکھا رت ایسی مثنویوں کی سب سے اچھی مثال ہے جہاں ہم فطرت کو اپنے اس قدر نزدیک پاتے ہیں گویا اس میں شناوری کر رہے ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت ہم سے ہم کلام ہو۔ فطرت کی کیفیات ایک غریب الوطن پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں، کیسے اسے اپنے دیار کے باغ دراغ یاد آتے ہیں، حالی کی برکھا رت ان تمام باتوں کو بڑی صناعی کیساتھ بیان کرتی ہے۔ یہیں سے حالی کا رجحان دھیرے دھیرے حب الوطنی کی نیشنل تحریک کی طرف مائل ہوتا نظر آتا ہے جس نے آگے چل کر ان سے حب الوطن ایسی زوردار نظم لکھوائی جو بظاہر تو پانی پت سے دور رہنے کے باعث لکھی گئی مگر حقیقت میں وطن پرستی کے ایسے نقوش اس میں ملتے ہیں جو پروپیگنڈہ اور خطابت سے دور ہیں اور جنھیں ایسے خیالات کی بازگشت سمجھنا چاہیئے جو شاعر کے خون میں جذب ہو کر رگ و پے میں اتر چکے ہیں اور جنھوں نے شعریت کا جامہ پہن لیا ہے۔

حب الوطن، کا سن تصنیف ۱۸۷۴ء ہے اور انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد تقریباً دس برس بعد باقاعدہ طور پر رکھی جاتی ہے مگر ہندوستانی سماج میں نیشنلسٹ خیالات کی رو بہ ۱۸۵۷ء کی تحریک ہی کے ساتھ چل پڑی تھی جو منظم نہ ہونے کے باعث کہیں کامیابی اور کہیں ناکامی سے دوچار

ہوتی رہیں اس میں شک نہیں کہ حالی مغرب سے بے طرح متاثر تھے ، ان کی ہر چیز کو قدر و ستائش کی نظر سے دیکھتے تھے قیصرۂ ہند کی شان میں قصیدہ بھی لکھتے جس میں اس بات کی بھی تمنا کرتے کہ نہ صرف اس وقت ہندوستان انگریزوں کے زیر سایہ رہے بلکہ ہندوستان کی آئندہ نسلوں پر بھی سایہ قیصر، سایۂ یزداں کی طرح قائم رہے مگر حالی کے اندر جو ہندوستانی تھا وہ ان سے ایسی باتیں کہلا دیتا جس کا شاید انھوں نے شعوری طور پر ایک نیشنلسٹ کی طرح ادراک نہیں کیا تھا حب الوطن کو چاہے انفعالی اثرات کی بازگشت سمجھا جائے چاہے پانی پت سے دوری کا سبب سمجھا جائے پھر بھی مگر حب الوطن ایک ایسی نظم ضرور ہے جسے اس دور کی پابندیوں زباں بندی اور غدر میں شریک ہونے کے نتائج کو دیکھتے ہوئے یہ ضرور کہہ دینے کا جی چاہتا ہے کہ اس میں ہماری تحریک آزادی کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو ہمیں غلامی کی زنجیروں سے چھڑانے کے لئے ہماری غیرت اور حمیت کو جوش میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں ۔ افراد قوم کو قوم کی اہمیت اور حیثیت کا احساس دلا رہی ہیں ۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد؟ نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

ملک میں اتفاق سے آزاد شہر میں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

قوم کا مبتذل ہے جو انساں بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جسکی ہے ممتاز ہے فقیری میں بھی وہ باعزاز

حالی نے جس زور و شور سے نئے طرز کی شاعری کو ابھارنے کی کوشش کی تھی، اپنے فن کو اتنا بلند کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ انھوں نے انگریزی ادب سے سادگی، اصلیت، اور جوش کا سبق سیکھا تھا اور اس تجربے کو وہ ہر ممکن کوشش کے ساتھ اپنے ادب میں اتار دینا چاہتے تھے مگر اس تجربے کا استعمال خاص طور پر سادگی اور اصلیت کا استعمال اس حد تک کیا کہ شاعری بہت کچھ میکانکی ہو گئی۔ کم از کم ان کی مثنویوں میں اس کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر مسدس اور دو ایک زوردار مثنویاں نہ ہوتیں تو شاید انکی پوری نظمیہ شاعری پر اس کا اطلاق ہو جاتا۔ یہ تو کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ حالی فن سے نابلد تھے اور فن کی کمی ان کی نظموں میں ہے۔ اس لئے کہ فن کی تعریف بھی اسی طرح مشکل ہے جس طرح شعر اور تغزل کی ——— مگر یہ ضرور ہے کہ کوئی ایسی چیز اس میں سے کم ہو گئی ہے جس کے باعث حالی کی مثنویاں مجموعی طور پر بے جان سی نظر آتی ہیں دو ایک کو چھوڑ کر ان کی تمام مثنویاں بلندی کے منارے تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ممکن ہے کہ

ان کے واعظانہ انداز نے یہ صورت اختیار کرلی ہو جس پر مولویت کا رنگ غالب ہے تاہم ان کی کوششوں نے ان کے اس مشن کو کامیاب بنایا جس کو لے کر وہ اٹھے تھے اور وہ حقیقت نگاری اور خیال کی اولیت کی تحریک تھی حالی کے بعد جتنی بھی نظمیں اور مثنویاں لکھی گئیں ان میں ان کی تحریک پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کی مثنویوں میں خواہ لذت ملے یا نہ ملے، فن کی چاشنی ہو یا نہ ہو، مگر انھوں نے اردو شاعری کو ایک ایسا راستہ دکھا دیا جس پر چل کر اردو شاعری مغرب کے خیالات اور جذبات سے آنکھیں چار کر سکتی ہے اور یہی ان کی سب بڑی کامیابی ہے۔

عبدالاحد خاں خلیل

حالی اور جدید اردو غزل

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جو سیاسی اور سماجی تبدیلیاں ہمارے ملک میں رونما ہوئیں اور ان کے جو اثرات ہمارے ادب، اخلاق اور ہمارے تمدن پر پڑے ان سب کی آئینہ داری حالی اور ان کی جدید غزل میں موجود ہے۔ انھوں نے زمانہ سے سبق لیا اور قدیم روایتوں کو جدید اقدار کی ترازو میں تولا۔ صاف ستھری چیزیں الگ کیں اور کوڑا کرکٹ نظر انداز کرتے ہوئے نئی اور پرانی قابل قدر چیزوں کو ایک رشتہ میں پرو دیا۔ زمانے کے ساتھ چلنے کا سبق سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔ طرز کہن پر اڑنے کو مذموم قرار دیا اور آئین نو سے لوگوں کو روشناس کیا۔ پوری طرح چھان بین سے کام لیا اور جدید قسم کی بوتلوں میں قدیم مشروبات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔

حالی کو صنف غزل سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ ان کی اس نکتہ چینی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس اہمیت سے کیا جا سکتا ہے کہ جو

انھوں نے صنف غزل کو اپنے مقدمہ شعر و شاعری" میں دی۔ انھوں نے غزل میں نئے موضوعات اور نئے تجربات کی ہمت افزائی کی اور کار آمد اصلاحی تجاویز پیش کر کے اس کو نئی زندگی اور غیر معمولی توانائی کا حامل بنا دیا۔ اگرچہ غزل کی ہئیت اور فن میں انھوں نے کوئی خاص اضافہ یا ترمیمات ضروری نہیں سمجھیں لیکن اس کی فکر میں انھوں نے خوش گوار نئے ابواب کے اضافے کئے اور اس طرح غزل کو صرف "از زنان سخن گفتن" کے محدود دائرے سے نکالکر "ضروری باتیں کرنے' اور درد دل بیان کرنے کا وسیلہ بنا دیا انھوں نے غزل میں معاملات عشق و محبت بیان کرنے کا نیا انداز اختیار کیا اور ماحول سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہونے کا نیا طریقہ ایجاد کیا۔ انھوں نے قدما کے فیصلوں پر نئے نکات ادب کا اضافہ کیا اور قدیم راستوں پر جو پریشانیاں عام ہو گئیں تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ایک نقاد فن کی حیثیت سے انھوں نے اصناف سخن کی غیر فانی قدر و قیمت کو پہچانا اور سنگریزوں میں کھوئے ہوئے لعل و جواہر کو اپنے اصلی رنگ و روپ میں جوہر شناسوں کے سامنے پیش کیا۔ بالخصوص غزل پر ان کی تنقید کے جو صحت بخش اثرات ڈالے وہ غیر متناہی ہونے کے علاوہ ایسے دلکش اور نظر نواز ہیں کہ ہر لمحہ ان پر آب حیات کے چھینٹوں کا گمان ہوتا ہے حالی نے یہ نگاہِ تنقید، یہ روح خجستہ بنیاد اور یہ مزاج پختہ اساس کہاں سے اور کس طرح حاصل کیا۔ اس کی داستان کافی طویل ہے اور

موقع پر مختصراً اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

پہلی چیز جو اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے وہ حالی کی فطری قابلیت اور مزاجی اصلاح پسندی ہے وہ ایک متحرک کردار کے انسان تھے اور روایت پرستی و قدامت پسندی سے بالطبع نفور۔ انھوں نے تحصیل علم کے شوق میں گھر کا عیش و آرام چھوڑا۔ اور نو عمری ہی میں ۱۸۵۲ء میں دہلی کا سفر اختیار کیا۔ اگرچہ اس زمانہ میں مذہبیت ان کے دل و دماغ پر کافی مستولی تھی۔ لیکن "خوب" سے "خوب تر" کی تلاش بھی ان کے مزاج کا جزو لاینفک بنی ہوئی تھی۔ وہ اس اولین سفر کے سلسلے میں تقریباً ڈھائی سال دہلی کی جامع مسجد کے قریب ایک پرانے انداز کے مدرسے میں اقامت گزیں رہے اور "دہلی کالج" کے محلے کو کبھی دیکھنے تک نہ گئے لیکن غالب سے عقیدت اور ان کے ذہن رسا کی افضلیت اسی زمانہ میں ان کے فکر و نظر کا مرکز بنی۔ اور اس ہی عقیدت کی بدولت انھوں نے آخر عمر میں یادگار غالب کا سنگ بنیاد رکھا بلکہ اسکو بکمال حسن و خوبی تکمیل کو پہونچایا۔

حالی با دل ناخواستہ ۱۸۵۵ء میں دہلی سے پانی پت واپس چلے گئے۔ لیکن علم و فضل سے لگاؤ کی کچھ ایسی لگن اپنے ساتھ لیتے گئے کہ جس کے لئے پانی پت کی فضا کبھی تسلی بخش نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بہانے کے متلاشی رہے اور تلاش معاش کا سلسلہ نکال کر کچھ سال بعد پھر دہلی آ گئے۔

اپنی فطری صلاحیت اولین سفر دہلی اور غالب سے رسم و راہ کے

علاوہ جو تھی چیز جس نے حالی کے نظریہ شعر و سخن کو متاثر کیا وہ ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعارف تھا۔ خود ایک خط میں لکھتے ہیں

"غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقدار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحب کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا۔ تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے

اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجا تھا مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی محبت سے ہوا۔"

(مسدس حالی۔ صدی اڈیشن)

شیفتہ کی صحبت نے حالی کی فطری اصلاح پسندی اور دقت نگاہ کو مزید جلا بخشی اور خود اعتمادی کے علاوہ ایک عملی انسان اور وقت کا ترجمان بنانے میں بڑا کام کیا۔ بقول حالی شیفتہ۔

"مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔"

(تذکرہ حالی۔ اسمٰعیل پانی پتی)

اس اثر پذیری کو حالی ہی کی زبانی موزوں الفاظ میں بھی سن لیجئے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

نواب مصطفیٰ خاں کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہو گیا اور حالی کو

فکر معاش کے سلسلے میں اب پنجاب کا رُخ کرنا پڑا ۔ چنانچہ اپنے جوہر قابل میں یہ سب صلاحیتیں لئے ہوئے حالیؔ لاہور پہنچے اور وہاں تقریباً پانچ سال مقیم رہے۔ ان کا قیام لاہور۔ بدلتے ہوئے حالات کو پوری طرح ذہن نشین کرانے اور مغربی ادب کے نئے انداز تنقید سے ان کو روشناس کرانے میں بیش قیمت خدمات کا ذمہ دار ہے۔ کرنل ہالرائڈ، پیارے لال آشوب اور مولانا آزاد کی صحبت نے ان کو خاص طور پر نیچرل شاعری کی طرف متوجہ کیا اور انگریزی لٹریچر کے ساتھ کچھ اس طرح وابستگی پیدا ہو گئی کہ مشرقی ادب اور قدیم انداز سخن سے ان کو کسی قدر بے تعلقی سی پیدا ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ نئے انداز کے مشاعروں میں چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں اور ادب میں نئی شاہراہیں نکالنے میں ترقی پسندوں کا ساتھ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں علی گڈھ تحریک کا چرچا ہر طرف پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ علی گڈھ کی سائنٹفک سوسائٹی اور سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کی سرگرمیاں ہر طرف عام ہو رہی تھیں سرسید احمد بقول خود شعر و ادب میں انقلاب پیدا کرنے، جھوٹی اور بناوٹی تحریروں کا اثر دلوں سے دور کرنے اور شاعری کی مروجہ خرابیوں اور خیال بندی کے ناقص طریقوں سے بچنے کی طرف مائل کرنے کا کام پورے زور و شور کے ساتھ شروع کر چکے تھے۔ اور لاہور بھی ان تحریکوں سے نا آشنا یا غیر متاثر نہ تھا لاہور ہی کے دوران قیام میں حالیؔ کو سرسیدؔ سے غائبانہ طور پر عقیدت پیدا ہوئی۔

اور بالآخر یہ عقیدت اس حد تک آگے بڑھی کہ حالی کچھ عرصہ بعد مدت العمر
کے لیے سرسید کے ہم مشرب و ہم نوا ہو گئے اور تنقید ادب و تہذیب اخلاق
میں ان کے دست راست بننے کے علاوہ ہمارے اصلاح پسندوں کے پیش خیل
بن گئے

قدرت مخصوص [illegible] حالی [illegible] اپنی فطری صلاحیت کی بدولت
نئے رجحانات کی طرف [illegible] دہلی کے سفر اولیں میں اپنی نگاہوں کو
وسعت دینا سیکھا، [illegible] کے رہنما و راہ پیدا کر کے وقت نظر و معنی آفرینی
سیکھی شیفتہ کی مصاحبت میں اپنے مذاق علمی کو نئی راہوں سے آشنا
کیا۔ لاہور کی ملازمت کے دوران میں غیر ملکی ادب سے خاص طور پر دلچسپی
پیدا کی، علی گڑھ تحریک کی مقبولیت کے زیر اثر ملک و ملت کے دردِ دل
میں حصہ لینا سیکھا اور آزاد کی صحبت میں شاعری اور نقد ادب، انشا پردازی
اور حقیقت نگاری میں توازن قائم رکھنے کا سلیقہ حاصل کیا اور سب سے
آخر میں سرسید کی رفاقت میں انسانیت و خلوص، صداقت و سوز دروں
خود انتقادی و پختہ مزاجی کے وہ آداب سیکھے کہ خود فخر قوم و سرآمد
شعرا بن گئے

حالی نے ویسے تو غزل گوئی نوعمری ہی سے شروع کر دی تھی اس
زمانہ میں ان کا رنگ بس وہی رہا تھا کہ جس سے کچھ دن کے بعد ان کا دل
پھیکا ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس موقع پر ان کے قدیم رنگ تغزل کی خصوصیات
کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ان کے جدید انداز فکر کا تذکرہ کسی قدر

تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

حالی کے جدید رنگ تغزل کی باقاعدہ ابتدا ۱۸۷۱ء سے ہوئی جبکہ وہ ایک عرصہ تک اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد تقریباً مستقل طور پر دہلی آ گئے اور پھر دہلی، علی گڈھ اور پانی پت کے ہو رہے ان کی غزل گوئی کا یہ سلسلہ اگرچہ تقریباً چالیس سال یعنی ان کے انتقال تک قائم رہا لیکن زیادہ زور صرف اول بیس سال رہا۔ عمر کے آخری بیس سال حالی نے زیادہ تر گوشہ نشینی نثر نویسی، نقد و نظر اور حیات نگاری میں گزارے ان کا جو مجموعہ کلام ۱۹۱۱ء کے بعد سے متعلق ہے اس میں چار پانچ سے زیادہ غزلیں نہیں ملتیں۔ صورت حال یہ تھی کہ ۱۸۹۳ء کے بعد سے حالی بالعموم اپنے اس شعر پر عامل رہے۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

۱۸۷۵ء کے بعد بہت ممکن تھا کہ وہ سرسید کے زیر اثر یکسر غزل گوئی ترک کر دیتے۔ لیکن کم از کم بیس سال انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ جس کی وجہ حالی حسب ذیل بیان کرتے ہیں۔

"اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ بہت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ شاعر کو ہمیشہ طول طویل مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بے کار بھی نہیں

رہ سکتی۔ اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقتٍ شاعر کے
ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جن سے اس کا
دل روزمرہ کسی واقعہ کو سنکر یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ مچ
متکیف ہوتا ہے ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ
سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل
یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی
کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے اور چند بسیط خیالات جو ایک
دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے، وہ غزل کے سلسلے میں بشرطیکہ
ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ہلکی
کر دی جائیں منسلک ہو سکتے ہیں۔"

(مقدمہ شعر و شاعری صفحات ۱۰۰۔ ۱۰۱)

زمانہ کا یا تھا خود لکھنؤ ان کا دل پرانی شاعری سے سیر ہو چکا تھا
ور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے" ان کو ضرور شرم آنے لگی تھی لیکن
غزل سے ان کا دل ہرگز بر نہیں ہوا تھا۔ اور وہ اس صنف سخن کو
یک کار آمد اور مفید چیز سمجھتے تھے۔ حالی نے غیر ملکی ادبیات کے
تقاضوں کے زیر اثر اپنی نثر میں دسیوں انگریزی الفاظ جا و بے جا
ستعمال کئے لیکن غزل کے لیے یہ طرز عمل کبھی مستحسن نہ سمجھا اور زبان و بیان
کے لحاظ سے غزل کو غزل ہی رکھتے ہوئے محض موضوعات کے سلسلے میں
س میں جدید عنوانات کے اضافے کئے۔ لکھنؤ اور دہلی کی مورچہ بندیوں

اور معرکہ آرائیوں سے اس کو نجات دلائی اور جمہوریت کی نشان پیدا کر کے خواص کے علاوہ عوام تک اس کی آواز پہنچائی، مسلمانوں کو اپنا "بستر نرم" بھول جانے کی تلقین کی اور "خاکستر گرم" کے اندیشوں سے خبردار کیا۔ غزل کو محض "استفادی" سے "افادی" بنایا اور بقول اقبال اپنی نوائے درد کو سرمایۂ گداز بنا کر قوم و ملت کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔

حالی زنوا ہائے جگر سوز نیا سود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

حالی نے صنف غزل پر تنقید کی لیکن اس کو گردن زدنی کبھی قرار نہیں دیا۔ انھوں نے موضوعات غزل میں بالخصوص اسی وجہ سے اصلاح ضروری سمجھی کہ غزل کی ہر دل عزیزی کو کوئی اور صنف سخن نہیں پہنچ سکتی تھی اور عوام و خواص کے مزاج و مذاق کی درستی و تہذیب بہ نسبت دیگر اصناف سخن کے غزل کے ذریعہ سے زیادہ آسان اور خوش آیند تھی۔

حالی کی شاعری کے مختلف ادوار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور تغزل میں انھوں نے بالعموم ان ہی آداب و روایات کا لحاظ رکھا کہ جو اس زمانہ میں ہماری شاعری کی جان تھیں، اور ہر طرف اہل سخن کی غزلوں میں پائی جاتی تھیں۔ مذہبیت اور اخلاقی مضامین سے دلچسپی۔ واعظ و ناصح پر طنز و طعن۔ صوفیانہ یا متصوفانہ اندازِ فکر۔ اساتذہ قدیم کی پیروی۔ سلاست زبان و بیان

اور روایتی عشق و محبت کے تذکرے بالعموم اس زمانہ میں ان کی غزل میں نمایاں رہے۔ مجموعی طور پر اگر حالی کی غزلوں پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ حالی کی غزل گوئی کی خصوصیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ابتدائی خصوصیات۔ (۲) مستقل اور بنیادی خصوصیات (۳) اضافی خصوصیات۔

ابتدائی خصوصیات سے وہ خصوصیات مراد ہیں کہ جو ابتدائی مشق سخن کے دنوں میں ان کے کلام کی خصوصیت رہیں۔ لیکن جب ان کی شاعری پختہ مشقی کے منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھی تو ان خصوصیات کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور وہ باتیں ایک ایک کر کے متروک قرار دی جانے لگیں۔ مثلاً ابتدائی دور میں دیگر غزل گو شعرا کی طرح وہ بھی بغیر کسی مقصد یا مجبوری کے غزل گوئی یا قافیہ پیمائی کیا کرتے تھے۔ جدید رنگ تغزل میں انھوں نے یہ لامقصدیت بالکل ترک کر دی۔ اور غزل کے لیے جب قلم اٹھایا تو کسی اصلاحی جذبے، داخلی ترجمانی، اخلاقی تاثر یا حالات عصریہ پر تنقید و تبصرے کے لئے۔ اسی طرح روایتی عشقیہ رنگ اور مذہبیت سے والہانہ دلچسپی جو ان کے ابتدائی کلام میں نمایاں رہتی تھی جدید رنگ تغزل میں تقریباً ترک کر دی گئی۔

مستقل اور بنیادی خصوصیات سے وہ رجحانات مراد ہیں کہ جو ابتدائی کلام میں بھی نظر آئے اور دور جدید میں بھی ان خصوصیات کا تعلق حالی کے مزاج سے ہمیشہ کافی گہرا رہا۔ ویسے ان کے جدید رنگ تغزل کی بنیادی اور اضافی خصوصیات قرار دی گئیں۔

۔ تیسرے قسم کی خصوصیات جن کو
اضافی کہا گیا ہے۔ ان سے وہ رجحانات مراد ہیں کہ جو نئے حالات
بدلتے ہوئے ماحول اور غزل میں تنقید حیات سے متعلق ہیں یہ خصوصیات
ابتدائی دور میں مفقود تھیں لیکن درمیانی اور آخری دور میں بہت
واضح اور اجاگر ہو جاتی ہیں۔

ابتدائی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے حالی کے جدید رنگ
غزل کی بنیادی اور اضافی خصوصیات کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ
کیا جاتا ہے تاکہ پوری طرح اندازہ ہو سکے کہ حالی نے ہماری غزل
کے کارناموں کو کس قدر وسیع آفاقی اور معیاری بنا دیا اور نئی نسلوں
کے لیے غزل سے رابطہ برقرار رکھنے کا کیا ساز و سامان مہیا کر دیا۔

۔ لب و لہجہ کی نرمی | حالی نے رفتار زمانہ و کردار احباب۔ انقلاب
روزگار و گفتار شیخ و شباب پر احتجاج کیا لیکن ہمیشہ نرم و نازک
آواز اور زیر لب زہر خند میں ان کی طنز و تعریض نے کبھی "زخم تیغ"
کی صورت اختیار نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ جراح کے نشتر یا چبھتی ہوئی پھانس کی
طرح اپنی کھٹک یا دل دوزی کی بدولت روح کا نشانہ بنا کر زخم زنی کی۔
اور رگ جاں کے ہر تار میں لرزش اور تھرتھری پیدا کر دی بعض اوقات
اس سلسلہ میں حالی کی آواز اتنی مدہم ہوتی ہے کہ بقول شخصے سنائی بھی
نہیں پڑتی۔ لیکن اپنا کام کر جاتی ہے۔ اسی انداز میں کبھی کبھی وہ ایسے
دلکش اشعار کہہ جاتے ہیں کہ غزل کی عظمت اور انداز بیان کی ندرت

ہمیشہ کے لئے سننے اور سمجھنے والوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے بلکہ خون کے ساتھ رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے اور اپنی دل گدازی، جاں نوازی اور تاثیر کی بدولت دوسروں کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی ہے۔

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

۲۔ حالی کی دوسری خصوصیت اخلاقیات سے دلچسپی ہے۔ اس قسم کے مضامین وغیرہ وغیرہ اگرچہ ان کی قدیم غزل میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن جدید دور تغزل میں یہ رجحانات واضح تر ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی غزلیں بعض اوقات تغزل کی خصوصیات و لوازم سے بے نیاز ہو کر پند و نصائح کو اپنا موضوع بنا لیتی ہیں اور غزل کے بجائے وعظ و خطابت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں۔

خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو | باپ دادا کی بڑائی ہو چکی
جانور، آدمی، فرشتہ، خدا | آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا | مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ وغیرہ وغیرہ

۳۔ طنز و مزاح | اس دور میں حالی کی غزلوں میں طنز و مزاح شوخ تر ہو جاتا ہے۔ ریاکار زاہدوں اور بے عمل واعظوں پر چھینٹوں کے علاوہ

قومی کارکنوں اور ابن الوقت اشخاص پر بھی فقرے چسپت کرتے ہیں ان کو تکلف نہیں ہوتا۔ استعارے اور کنائے دل نشین تر ہوجاتے ہیں اور دل آزاری سے دامن بچاتے ہوئے اصلاح ملک و قوم کے مضامین غزل کے اشعار میں جا بجا نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً

مان لیجئے شیخ جو دعوے کرے　　اک بزرگ دین کو ہم جھٹلائیں کیا
ایسا جیسوں سے رہیں ساری نمازی ہشیار　　اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

وغیرہ وغیرہ

۴۔ معرفت و حقیقت: عارفانہ مضامین اگرچہ کسی حد تک ابتدا ہی سے حالی کی غزلوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں لیکن دور جدید میں ان کا رنگ بے حد دلکش اور جاذب نگاہ ہوجاتا ہے۔ کلام میں عمق اور گہرائی زیادہ ہوجاتی ہے اور اہل حال اور اہل قلم دونوں اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

کاوش میں ہے الٰہی وگدا میں ہے طبیعی
جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر　　وہی اصرار ہے خطاؤں پر
جلتے ہیں جبرئیل کے شہپر جہاں　　بے پروں کی واں رسائی ہوچکی

وغیرہ وغیرہ

۵ قدیم روایات کا احترام | وضعداری اور قدامت پسندی حالی

کا مزاج تھی اور عمر بھر ساتھ رہی۔ جہاں ان کی غزلوں میں خوب سے خوب تر کی جستجو ملتی ہے وہیں ظہیر دہلوی اور رشید لکھنوی سے عقیدت بھی پائی جاتی ہے ان کو نئے انسانوں اور نئی بستیوں کی تلاش یا تخلیق کی خواہش ضرور ہے لیکن قدیم تہذیب کی لاشوں پر نہیں بلکہ انسانیت کے طریق پر اور تعمیری تقاضوں کی روشنی میں۔

زبان و بیان کے معاملہ میں وہ اس سب لسانی خصوصیات اور علامتی لطافتوں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو قدما کے لیے مایہ ناز تھیں اور آج ان کی یادگار ہیں بقول حضرت سیماب اکبر آبادی۔

مولانا نے آخر دم تک ان تمام الفاظ کو اپنے کلام میں بھایا جن کو اساتذۂ قدیم نے حسن کلام و زبان کے لئے موزوں سمجھا تھا مثلاً سو، پہ، پر، معنی اگر، تلک وغیرہ۔ یہ وضع کی پاسداری تھی کہ گو ان الفاظ کو داغ و امیر و جلال نے اپنی متروکات کی فہرست میں داخل کر کے عیوب کلام میں شامل کر لیا۔ لیکن مولانا نے انہیں الفاظ سے اپنے کلام کی سادگی میں سو حسن پیدا کر لئے ؛؛

(حالات حالی۔ مؤلفہ سیماب اکبر آبادی)

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ قدیم اساتذہ کے احترام کے علاوہ حالی کے ذہن میں یہ مسئلہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا کہ

اپنی زبان اور انداز بیان میں سے کوئی ایسا لفظ یا فقرہ کم نہ ہونے پائے کہ جس کا چلن ہر طرف عام ہو یا جو اسلوب نگارش کے اعتبار سے عام فہم ومقبول ہو۔ انھیں اپنی زبان سے محبت تھی اور اس کی وسعت وآفاقیت دل وجان سے عزیز۔ اسی خیال سے انھوں نے متروک الفاظ بھی ترک نہیں کئے اور اجنبی لیکن کارآمد الفاظ کو بھی رائج رکھنے کی کوشش کی۔

حالی نے صنائع لفظی ومعنوی کا بھی استعمال کیا۔ محاوروں اور قدیم استعاروں سے بھی کام لیا۔ صائب کے رنگ میں تمثیل نگاری بھی کی اور بعض اوقات لکھنوی رنگ میں مرصع کاری بھی لیکن ہمیشہ آورد کو آمد بنا کر اور زبان وبیان کے چٹخاروں کو سلاست وروانی کی جان بنا کر۔ اشعار میں ایسے الفاظ بھی استعمال کئے کہ جن پر مفہوم شعر کی اہمیت کا دارومدار رہا ہو اور جنھوں نے "کلیدی" الفاظ کا کام کیا ہو۔ انھوں نے ایسے محاورے بھی استعمال کئے کہ جن کو "علامتی" اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ لیکن اس قسم کی چیزوں کو انھوں نے کبھی گورکھ دھندا یا معمہ نہ بننے دیا اور ابہام وتعقید سے ہمیشہ کوسوں دور رہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد — یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

دھوم تھی اپنی پارسائی کی — کی بھی اور کس سے آشنائی کی

داغ مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز   وغیرہ وغیرہ

۳۔ انفرادی رنگ تغزل | حالی نے قدیم اساتذہ کی تقلید و عقیدت کے باوجود نیا ایک مخصوص رنگ نکالا اور اس پر قائم رہے۔ اپنی قدیم غزلوں میں انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ۔

دل پر درد سے کچھ کام لوں گا
گر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

جدید غزل کے دور میں انہوں نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا اور طرز نئی رسومات عمومی عشق کو قدرے دامن بچاتے ہوئے بہت کچھ دل دردمند کی واردات بیان کیں۔ انکی غزلیات اور مسدس النساں اکثر پژمردہ و مردہ قوموں کو نئی زندگی عطا کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور ذوق کردار پر بڑی خوبی سے آمادہ کرتی ہیں۔ حالی اپنے جدید دور تغزل میں انفرادیت کے ایک ایسے بلند مقام پر متمکن نظر آتے ہیں کہ ان کی رہنمائی آئندہ نسلوں کو منازل ترقی پر پہنچانے کے لئے مینارۂ نور کا کام کرتی ہے اور ان کی بے تکلفی اور خود اعتمادی ہمہ مرنجان مرنج اور خود اعتقادی "نوائے وقت" بنکر بے مثل خصوصیت بن جاتی ہے۔

ہم تو حالی یہی طرز پہ ہے جادو   طرز شعر فصحا و بلغا اور سہی
دل ہے نایاب ہر گام کہ ہیں اکثر بے جگر   شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ
دوست ہے گلے دیکھے ہیں سے حالی مگر   رنگ کچھ تیری ادا میں نیا پاتے ہیں ہم

وغیرہ وغیرہ

۷۔ غزل مسلسل | ہر دور میں حالی کی یہ کوشش رہی کہ غزل میں ایک مرکزی خیال کو مربوط صورت میں پیش کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے مسلسل غزل لکھنے کی کوشش کو مقبول بنایا جائے۔ قدیم رنگ تغزل میں یہ خصوصیت عشق و محبت کی داستانوں یا کوائف و حوادث روزگار کو مربوط شکل میں پیش کرنے کے لیے رائج تھی لیکن جدید دور تغزل میں یہ رجحان عام طور پر سیاسی و سماجی مسائل پر تنقید کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور موضوعات سخن زیادہ تر تعمیری و اصلاحی بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ غزلوں کے مطلعے پیش کئے جاتے ہیں۔ پوری غزلوں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تسلسل مفہوم کے لحاظ سے یہ غزلیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

کاٹئے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

کرتے ہیں سو سو طرح سے جادہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر وغیرہ

۸۔ دلکش انداز تغزل | اس سلسلے کی آخری خصوصیت حالی کا دلکش انداز تغزل ہے۔ ان کے اشعار کی دلسوزی حسن و محبت کی چھیڑ چھاڑ بھولی بسری

باتوں کی یاد۔ حسن بیان کا جادو۔ ترنم و سوز۔ شباب و شادمانی کا ماتم اور ادائے مفہوم کی لطافت خاص طور پر جاذب نظر ہے۔ دور جدید کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا   بس آگیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے
اس کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں   دیکھنا آپکی اور آپ کے گھر کی صورت
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر   تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
بیقراری تھی سب امید ملاقات کیساتھ   اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید   خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
بہت کام لیتے تھے جس دل سے ہم کو   وہ صرف تمنا ہوا جاتا ہے
وفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک   دل اپنا بھی تجھ سا ہوا جاتا ہے

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے!   وغیرہ وغیرہ

آخر میں اب اضافی خصوصیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ جو قدیم دور غزل میں تقریباً مفقود تھیں لیکن جدید دور سخن میں خاص طور پر نمایاں رہیں۔ اس زمانہ میں حالی کا قلم حالات حاضرہ کے تبصرے اور سیاسی مسائل کی تنقید میں کافی بے تکلف بلکہ بیباک ہو جاتا ہے اور ہر قسم کے سیاسی و بین الاقوامی واقعات اس کے زیر تبصرہ آجاتے ہیں۔ مثلاً روس و جاپان کی جنگ سے متاثر ہو کر حالی کہتے ہیں:۔

لگاؤ نہ اس دار فانی سے دل   عیاں جن کی ہیں سست پیمانیاں

گل آواز بلبل یہ ہیں ہم نفس رہے   کہ کے دن کی ہیں یہ خوش الحانیاں
بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ   بنی نوع پر آتش افشانیاں
جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام   جہاں داریاں اور جہانبانیاں

ایران اور مراکو کی تباہی اور ترکی کے مریض نیم جاں کی خستہ حالی پر درد دل کا اظہار کرتے ہوئے ۱۹۱۲ء میں حالی لکھتے ہیں:۔

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف   چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا   ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زورمند ضعیف   بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے   گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
تشنۂ خوں ہیں بھو کے شیروں کے   حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز

وغیرہ وغیرہ

اسی قسم کے دیگر سیاسی مسائل پر غزل میں حالی کی تنقید ملاحظہ ہو:۔

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت   فرمایا خبردار! کہ نازک ہے زمانہ
روسی ہوں یا تاتاری ہم کو ستائیں گے کیا   دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے   تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

حالی نے اس دور میں اپنی غزل میں جا بجا سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ کیا ہے انھوں نے کبھی غیر ملکی غلامی سے نفرت کا اظہار کیا ہے اور کبھی قومی بدحالی پر پریشان خاطری کا مظاہرہ۔ کبھی روح آزادی کے مجروح ہونے کا ماتم کیا ہے اور کبھی تعلیم و تہذیب کی طرف سے

بے اتفاقی پر اظہار تاسف۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

قید خانے میں گیا دل جن کا لگ
ان اسیروں کی رہائی ہو چکی

صفائیاں ہے رہی ہیں جتنی دل تنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کئے بغیر

ہونا پید جس ملک میں اتفاق ہیں آبادیاں وہاں کی ویرانیاں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

ایک اور مخصوص رجحان جو حالی کی غزلوں میں اس دور میں نمایاں نظر آتا ہے، وہ مقامی تشبیہات کی طرف توجہ ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی طغیانیوں سے متاثر ہو کر حالی اب ادب میں ہندوستانیت و مقامیت کی اہمیت کے قائل ہو گئے ہیں اور سماجی خوشگواری کے لئے نیچرل شاعری میں سنسکرت و برج بھاشا کے خزانوں سے استفادہ ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ ایک موقع پر خود لکھتے ہیں:۔

سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم از کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثال کا مصداق بنانا ہے کہ دریا میں رہنا

اور مگر مجھ سے بیزار"

(خمخانہ جاوید۔ جلد دوم تقریظ از حالی)

ان کی اس دور کی غزلوں میں آب رود گنگا اور ہندوستانی کھیتوں کے کچھ تذکرے ملاحظہ ہوں:۔

بڑی اور بھلی سب گذر جائے گی   یہ کشتی یونہیں پار اتر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا   کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا   کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
مشکل ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل کیجئے کہ گنگا نہائیے   وغیرہ وغیرہ

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اس پیغام کا بھی تذکرہ کر دیا جائے کہ جو انھوں نے بڑے سلیقے سے اہل ملک و اہل سلطنت کے ذہنوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اور اپنی غزل کو اس کا وسیلہ بنایا۔ یہی وہ ابتدائی، انقلابی اور مفکرانہ آواز ہے کہ جس کی پرجوش بازگشت ہم کو آگے چلکر اکبرؔ اور بالخصوص اقبالؔ کے کلام میں سنائی دی اور ہمارے جدید ادب کی روح رواں بنی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

معنی کا تم نے حالیؔ دریا اگر بہایا   یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا   ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی   لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بیکار تجھ کو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا وغیرہ وغیرہ

نقد و نظر کے معاملہ میں حالی نے جو اپنا طریق کار رکھا او نکتہ چینیوں کے جواب میں خاموش رہنے کے جس اصول پر عمل کیا اس کا راز خود ان ہی کے الفاظ میں سن لیجئے۔

"جس طرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا اسی طرح ہم عنقا نکتہ چینیوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت" (دیباچہ دیوان حالی)

اسی اصول کو وہ اپنی غزل کے ایک شعر میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی کی شاعری نے ہماری سوسائٹی اور ہمارے ادب پر بے پایاں اثر ڈالا اور وہ آج بھی ہمارے لئے بصیرت آموز و نگاہ افروز ہے انھوں نے پوری احتیاط برتی کہ جدید غزل کی بنیاد اس طرح رکھی جائے کہ "خشت اول کج نہ ہونے پائے" اور یہ ان ہی کے دست مبارک کی برکت ہے کہ آج فیض و فراق۔ اثر و جگر کے ہاتھوں ہماری جدید غزل کی عمارت آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور ایام گزشتہ کی طرح آج بھی دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ مقبول، ممتاز اور منفرد ہے۔ اس کا

حال شاندار ہے اور اس کا مستقبل روشن سے روشن تر ہونے کی توقعات کی جا رہی ہیں اگرچہ کبھی کبھی اب بھی اس قسم کی آوازیں کہیں کہیں سے سنائی دے جاتی ہیں کہ غزل کا احیار ہماری شاعری کے لئے شگون بد ہے لیکن وہ نقار خانے میں طوطی نہیں بلکہ تاشے کی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ غزل آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ اور ان صلاحیتوں کی بدولت جو فطرت نے اس کو ودیعت کی ہیں۔ دل کی آواز بن کر قلب و نظر میں سماتی رہے گی اور رمز و ایما میں ان سب "ناگفتنی ہائے حیات" کو "گفتنی" بناتی رہے گی کہ جن کا کھل کر بیان کرنا مصلحت وقت کے خلاف ہو یا تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی زد میں آسکتا ہو۔

باسط علی سندیلوی

حالی کی شاعری اور اودھ پنچ

مولانا حالی کی شاعری کا میدان نہایت وسیع ہے انھوں نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور شعوری طور سے ہند اس سے بدتر شاعری کو شعر بسیار و شکل آمیز بنانے کی کوشش کی اور خزاں رسیدہ شاعری کے چمن کو اپنے خون جگر سے اس طرح سیراب کیا کہ چمن سرسبز و شاداب ہو گیا گلہائے ادب میں حیات تازہ آگئی اور ان کے فطری حسن و جمال اور قدرتی رنگ و بو سے مبصران چمن کا دل و دماغ معطر ہو گیا لیکن کچھ ایسے دیدہ ور بھی تھے جو صرف ظاہری حسن و جمال کے شیدائی تھے جن کو پر تکلف آرائش و زیبائش سے عشق تھا جو معنی سے زیادہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ پر جان دیتے تھے۔

حالی نے جان بوجھ کر رنگین بیانی چھوڑ کر سادگی اختیار کی تھی اور بے خبر گاہکوں کے آگے سب سے الگ لیے نایاب مال کی دکان

لگائی تھی۔ ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ

اور یہ دکان اس لئے کھولی تھی کہ حالی کی نظر میں اردو شاعری کذب و افترا کا دفتر تھی۔

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

اردو شاعری کے متعلق حالی نے اپنے خیالات دیوان حالی کے دیباچہ میں مقدمہ شعر و شاعری میں، مسدس حالی کے دیباچہ میں اور اپنی غزلوں اور نظموں میں، ظاہر کئے ہیں، یہاں ان سب کے اقتباس کی مضمون کی تنگ دامانی متحمل نہیں ہو سکتی البتہ حالی کا وہ مشہور قطعہ جو انھوں نے شعر کی طرف خطاب کے عنوان سے لکھا ہے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ قطعہ حالی کے نظریۂ شاعری کا نچوڑ ہے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
یہ تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپے کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کرکے رہیگا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو

اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اور ہی دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان ان کو جو ہو چارہ ساز تو

سچ پر حجاب، یا بہت سے کئے جاویں گھر
اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو

جو نابلد ہیں ان کو بتا جو رہن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جہان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر! راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرلی ہے تیج گرمی دنیا تو نے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد
اسکے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جو قدر داں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے گر اس پہ ناز تو

اس قطعہ میں حالی نے شعر کے لئے یہ ضروری سمجھا ہے کہ وہ دلگداز سادہ سچا، سحر حقیقت کو موج خیز کرنے والا، جھوٹ سے بچنے والا، بے بصروں سے ساز باز نہ رکھنے والا، نابلد کو جو رہن کی راہ بتانے والا، قوم کی خدمت کرنے والا، راہ راست پر پڑنے کے بعد، راستے کے نشیب فراز کی پرواہ نہ کرنے والا ہو اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کی دوا سے لوگ ناک چڑھائیں گے اور سچ کی قدر، بے قدریوں کے بعد ہوتی ہے، اس لئے اسے ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔ اور ایک اچھے چارہ ساز کی طرح علاج کرتے رہنا چاہئے۔ مقطع میں حالی نے صاف صاف کہدیا ہے کہ اے شعر! تیری ان خوبیوں پر حالی کو ناز ہے، تجھے بھی اس پر ناز کرنا چاہئے

حالی کی شاعری انھیں اوصاف کی حامل ہے انھوں نے جو کچھ لکھا اور شعر کے لئے جو جو باتیں ضروری اور اچھی سمجھیں ان کو خود بھی برتا اور مشورہ بھی دیا کہ دوسرے شعرا بھی ان پر عمل کریں کیونکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ سمجھتے تھے کہ اردو شاعری کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس کو بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنا چاہیئے۔ اس کا تعلق زندگی سے قریب تر ہونا چاہئے اور زندگی کو ظاہری یا خیالی حسن وعشق پہ فریفتہ ہونے کے بجائے حقیقی اور فطری حسن وجمال کا متوالا ہونا چاہیئے

"وہ اس راز سے خوب آگاہ تھا کہ زندگی کے رموز، پوری زندگی کے مطالعے سے منکشف ہوتے ہیں وہ یہ جانتا تھا کہ صرف لطیف وخوشگوار معارف پر اکتفا کرنے سے شاعر کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ وہ اس پر ایمان رکھتا تھا کہ انسان کو زندگی کی تلخیوں سے آگاہ کرنا، ہنستے ہنسانے، ہر وقت وخوش باش کرنے سے بہتر اور مقدس تر ہے۔ ان عقائد کے تحت اس نے شعری وجاہت و روایت کے کہنہ ایوان ڈھا دیئے اور لفظی معبدوں کے لات ومنات توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے۔" (صحیفۂ تاریخ اردو ڈاکٹر اکبر آبادی صفحہ ۲۴۶-۲۴۵)

لفظی معبدوں کے لات ومنات کے پجاری بھڑک اٹھے، ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی، ان کو اپنے خیالی اصنام کا معبد ڈھاتا نظر آنے لگا۔ یہ ادبی گمراہی و بے راہ روی تھی۔ مذہب شاعری میں یا

یہ کفر قابل گشتنی و گردن زدنی تھا

اللہ ری گرمی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ان کی تنقید برداشت کیا جا سکتا تھا؟ مخالفتوں کا طوفان شد و مد سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لکھنؤ اس مخالفت کا مرکز بنا کیونکہ بقول کشن پرشاد کول۔

مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی ہیں ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی نتیجہ اور صحیح نتیجہ [illegible] کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعرا کی توہین ہے ان خیالات کا دلوں میں [illegible] تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی۔

(کلام [illegible] مقدمہ پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی [illegible] سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی ۱۹۱۵ء)

لیکن [illegible] ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں [illegible] لکھنؤ [illegible] اور اس کے بعد حالی نے بطور انتقام لکھنوی شاعری کے معائب لکھے۔

مقدمہ [illegible] کسی ناعاقبت اندیش نے اس کی شاعرانہ غلطیاں شائع کیں اس کے بعد سے حالی نے شعرائے لکھنؤ سے خوب خوب انتقام لیا۔ تمام لکھنؤ کے لئے لکھ دیا کہ رعایت لفظی

اور مذاق سوقیانہ پر لکھنؤ کے شعراء کا دار و مدار ہے۔ ان کے حامی مقلدوں نے جو شعر و شاعری سے ناواقف ہیں اور رد و شعر پر تبصرہ و تذکرہ کے مدعی ہیں۔ آنکھ بند کرکے حالی کی نقل کرلی حالانکہ کسی شہر میں شاعری کے اتنے رنگ نہیں جتنے لکھنؤ میں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں تمام ہندوستان کے تمام اہل کمال جمع ہوئے جو ایک دوسرے سے مختلف مذاق کے تھے۔

(نظم اردو حاشیہ صفحہ ۱۰۸)

حکیم صاحب کی یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ حالی نے انتقام لینا تو کجا کسی ایک اعتراض کا جواب تک نہیں دیا۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ حالی نے تمام لکھنؤ کے شعراء کا مذاق سوقیانہ بتایا ہے میرانیس کیلئے یہ حالی ہی نے لکھا

اردو گو راج چار سو تیرا ہے — شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے

پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی — تو لکھنؤ کی ہے، لکھنؤ تیرا ہے

البتہ پنڈت کشن پرشاد کول کی رائے زیادہ صحیح ہے کہ "حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی" زیادہ تر مثالیں لکھنؤ کے شعراء کی دی تھیں۔ اور اودھ پنچ کی مخالفت کا خاص سبب یہی تھا۔ اس کا یہ بھی اعتراض تھا کہ

"مولانا حالی کی شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطری شاعری کی لطافت

رنگینی سے خالی ہے۔“ (گلدستہ پنچ صفحہ ۴)

اودھ پنچ کے اس خیال کے ہمنوا اور دوسرے اخبارات بھی تھے جو مولانا حالی کی شاعری پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور ان کے متعلق اس انداز سے خبریں شائع کرتے تھے جن سے ان کی ہجو ہوتی تھی۔ چنانچہ دہلی کے ایک خاص مشاعرے میں جب مولانا حالی نے غزل کے بجائے ایک قطعہ پڑھا تو یہ خبر اس طرح شائع ہوئی۔

”مولوی الطاف حسین حالی نے کوئی غزل نہیں لکھی بلکہ غزل نہ لکھنے کا عذر ایک قطعہ میں بیان کیا ہے جس کو سنکر میر مشاعرہ نے ان کو غزل پڑھنے سے معذور رکھا۔ قطعہ یہ ہے

ہو لی رلیاں جوانی کی بہار آخر حیف   طبع رنگیں تھی سے عشق کی جب متوالی

(ریاض الاخبار گورکھپور جلد ۴ نمبر ۲۵-۲۴ جون ۱۸۸۴ء صفحہ ۵)

اس قطعہ میں بھی حالی نے غزل کی فرضی اور جھوٹی شاعری کی تنقید کی ہے۔ اسی لئے غزل کے شیدائی کہتے ہیں کہ

”ہم ان کو شاعر نہیں سمجھتے، زبان دان نہیں جانتے“

(ریاض الاخبار جلد ۳۰ نمبر ۸- ۲۸ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲۔ اڈیٹوریل)

غرضکہ مخالفت کرنے والوں میں یوں تو بہت سے اخبارات اور رسائل تھے لیکن اودھ پنچ ان سب میں آگے تھا خوش قسمتی سے اس کے لکھنے والے سب اہل کمال تھے اس لئے ان کے اعتراضات میں وزن کے ساتھ ساتھ ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔ طنز و مزاح کے تیر اس انداز سے

چلائے گئے کہ زخم خوردہ بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنشیں نزاکت آواز دیکھنا

دشنام یار سنکر مومن اس کی نزاکت آواز پر ریجھے اور اودھ پنچ کی مخالفت پڑھ کر ناظرین، ظرافت بیان پر شیدا ہوئے۔

اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری کیا گیا۔ منشی سجاد حسین مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے وہ ابوالظرافت اور صاحب ذکاوت انسان تھے۔ انھیں کے دم سے اودھ پنچ کے حلقہ میں ایسے ایسے صاحبان قلم داخل ہو گئے جنھوں نے گلستان ادب کو زعفران زار بنا دیا۔ اودھ پنچ بڑی شان سے نکلا اور بہت جلد مقبول خاص و عام ہو گیا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا مناسب ہے کہ اودھ پنچ نے صرف حالی ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی زد سے داغ اور اقبال بھی نہیں بچ سکے اداعی شاعری، پنجابی شاعری کے عنوانات سے داغ اور اقبال کے کلام پر نکتہ چینی عرصہ تک جاری رہی۔

دیوان حالی ۱۸۹۳ء میں شایع ہوا۔ اور اس کے شائع ہوتے ہی اودھ پنچ کی بارود میں آگ لگ گئی۔ پھر کیا تھا۔ ظرافت کے پیرائے میں مخالفت کی گولہ باری ہونے لگی۔ ان حملوں سے پانی پت کا میدان پامال ہونے لگا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے   میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اودھ پنچ میں حالی کی مخالفت اور اعتراضات کا عنوان مذکورۂ بالا شعر ہوتا تھا اور اسی کے تحت نظمیں اور مضامین لکھے جاتے تھے اس کے علاوہ حسب ذیل شعر کے تحت بھی اعتراضات کئے جاتے تھے۔

"آئینہ ہے سب حالتِ حالی مرے آگے
چلنے کی نہیں حسنِ خیالی مرے آگے"

(اودھ پنچ جلد بست و نہم ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

دیوان حالی سے پہلے بھی اودھ پنچ میں حالی کے کلام پر اعتراضات شایع ہوتے رہتے تھے اور اس مسلک میں اس کے ہمخیال دوسرے اخبارات بھی تھے۔ حالی نے جدید شاعری کا آغاز لاہور کے مشاعرہ ۱۸۷۴ء میں کیا تھا۔ ان کے خیالات نے عملی شکل وہیں اختیار کی اس کے بعد اردو شاعری پر اپنے خیالات مختلف مضامین اور کتابوں کے دیباچوں میں ظاہر کرتے رہے مسدس حالی کے دیباچہ میں بھی اردو شاعری پر تنقید ہے مسدس ۱۸۷۹ء مطابق ۱۲۹۶ھ میں شایع ہوا۔ مسدس کی شاعری بے نمک کی ابالی کھچڑی تھی اور اس میں جسطرح خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ نہ تو ادیبوں اور شاعروں کے لیے قابل قبول تھا اور نہ عالموں اور مذہب کے ٹھیکیداروں کیلئے چنانچہ مسدس کے جواب میں متعدد مسدس لکھے گئے اور مخالفت ادبی سماجی، مذہبی، غرض ہر حلقہ سے شد و مد کے ساتھ ہوئی۔ اس کے علاوہ حالی کی ان تمام نظموں پر بھی اعتراضات ہوتے رہتے تھے

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں یا کسی اور جلسے میں پڑھی جاتی تھیں۔ حالی "پیر نیچر" سرسید کے ساتھ تھے اور ان کی تعلیمی تحریک کے روح رواں، سرسید کے مخالفین کی زد سے حالی کس طرح بچ سکتے تھے؟ خوب خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

ہائے میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے
سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھئے (اکبر الہ آبادی)

ان سب حضرات نے حالی کی ادبی سرگزشت کیلئے اودھ پنچ کو منتخب کیا۔ یہ سرگزشت بڑی دلچسپ ہے۔ ایک ایک لفظ تیر و نشتر سے زیادہ اثر کرتا ہے۔ مگر ظرافت کی کمان سے چھوٹتا ہے۔ ان تیر اندازوں میں کوئی مسٹر شوخ ظریف ہے، کوئی جادو رقم، کوئی حضرت دمباز ہے، کوئی ذواتا انفنان، کوئی بے عینک کا افیونی کوئی اللہ کا بندہ، کوئی م۔ ب علیہ الرحمہ، کوئی پیر نیچر، کوئی درویش صفت باش کلاہ تتری دار، کوئی مرزا لاابالی، کوئی الانسان ضعیف کوئی تقلید ہمدرد یعنی مسٹر لافر، کوئی مس چشتیہ گو لنگا نیہ، کوئی مبندہ لشکری مصلح و مجدد زبان اردو، کوئی نشتری، کوئی مسخر الدولہ بہادر، کوئی عروس الدولہ، کوئی مولانا حالی کا ظاہر میں شاگرد مگر باطن میں استاد اور کوئی نظر باز، غرضکہ ان ادبی تیر اندازوں کا ایک لشکر ہے؟ جس کے ترکش میں بیشمار تیر تھے۔ ان سب تیروں کا نشانہ مولانا حالی سے تھے۔

پانی پت پر یہ جو تھا عظیم الشان لشکر تھا جو طرافت و اعتراضات کے اسلحہ جات سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوا۔ اسد ملتانی نے پانی پت کی چوتھی لڑائی کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نظم مولانا حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر پانی پت میں پڑھی گئی تھی۔

خداوند آفاق نے پانی پت کی — کسی ایسی ساعت میں بنیاد ڈالی
کہ ہوتی رہیں اس میں اکثر لڑائی — نہ گذرا کوئی دور جنگوں سے خالی
ہیں مشہور تین خونریز جنگیں — ہے اوراق تاریخ پر جن کی لالی
ہوئی ان کے بعد ایک چوتھی لڑائی — مگر یہ لڑائی تھی سب سے نرالی

ادھر قوم کی گمرہی اور شقاوت — اُدھر اک مجاہد کی شان جمالی
ادھر قوم غافل کی ہر گونہ پستی — ادھر ایک مصلح کے افکار عالی
ادھر قوم پر خواب غفلت کا غلبہ — ادھر شاعر قوم کی زار نالی
ادھر بے شمار اعتراضات بیجا — ادھر چند نظمیں تکلف سے خالی
ادھر طعن و تشنیع کے تیر و نشتر — ادھر تلخ کامی میں شیریں مقالی
ادھر ایک بگڑی ہوئی قوم ناداں — ادھر اُو فریاد بے چارہ حالی

اسد یہ کرشمہ تھا صدق و صفا کا
کہ اک فرد نے قوم پر فتح پالی

(معارف ماہ شوال ۱۳۵۷ھ)

یہ جنگ مسلسل کئی برس تک جاری رہی اور اس میں علی گڑھ، لکھنؤ گورکھپور، دہلی اور لاہور کے شہسواران ادب نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ اسمٰعیل پانی پتی تحریر فرماتے ہیں:

"مسدس کی تصنیف اور سر سید کی طرفداری و رفاقت کی وجہ سے مخالفت اور دشمنی کا ایک زبردست طوفان ملک میں ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ خالی، خیالی، ذاتی جیسے سنجیدہ حریف ان کو زیر کرنے کو اکھاڑے میں آ ملے گئے .. مہینوں بلکہ برسوں ان پر نہایت سوقیانہ الفاظ میں آوازے کسے جاتے رہے۔ جب ۱۸۹۳ء میں دیوان اور مقدمہ شعر و شاعری شایع ہوا تھا تو اس نے پرستاران طرز قدیم کے خرمن عقل و ہوش پر بجلی کا کام کیا وہ اپنے آپے میں نہ رہے اور نہایت خلاف تہذیب اور بازاری الفاظ میں مولانا کو کوسنا شروع کیا۔ دیوان اور مقدمہ کی ایک ایک سطر پر فضول اور لایعنی اعتراضات کی بارش شروع کر دی۔ اور مدتوں نہایت استقلال کے ساتھ اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اودھ پنچ لکھنؤ میں جو سلسلۂ اعتراضات ۲۳ مہینے (۲ برس ۹ ماہ) تک شایع ہوتا رہا اس کا عنوان یہ شعر تھا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولانا حالی سب کچھ سنتے تھے اور پڑھتے تھے مگر نہایت صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور کبھی کوئی ایک مضمون بھی آپ نے ایسے لوگوں کے خلاف کسی اخبار میں نہیں لکھا۔ (تذکرہ حالی صفحہ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰)

حالی اپنے نکتہ چینوں کو خاموش کرنے کا گر جانتے تھے خود کہتے ہیں

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا (حالی)

حالی کی ایک خاموشی نے بالآخر ان تمام حملہ آوروں کو پسپا کر کے چھوڑا اور ان کی خاموش و پرخلوص صدا سے غیر اپنے، دشمن دوست اور نکتہ چیں مداح بن گئے۔ حالی کو اپنی کامیابی پر یقین تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی اک دن کام کر جائے گی

اسی یقین پر وہ ناگوارا کو گوارا کرتے رہے یہ انہیں کا دل گردہ تھا کہ طعن و تشنیع کے تیر و نشتر کھاتے رہے اور اف تک نہ کی۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اودھ پنچ میں حالی پر اعتراضات

کا سلسلہ مقدمہ شعر و شاعری اور دیوان حالی شائع ہونے سے بہت پہلے شروع ہوچکا تھا۔ اودھ پنچ حالی کی جدید شاعری کے تین سال بعد جاری ہوا۔ اس تین برس کے عرصہ میں حالی کی جدید شاعری مخالفت کے باوجود ادبی حلقوں میں اپنا اثر کرتی جا رہی تھی۔

مجالس النساء کا ذکر کرتے ہوئے پنجابی اخبار ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء لکھتا ہے:۔

"یہ مولوی الطاف حسین حالی کی تصنیف ہے جن کے علم اور فصیح البیانی کا ہر طرف چرچا ہے اور جن کی نظمیں انجمن لاہور کے مشاعرے میں جان ڈال دیتی ہیں"

(از مقالات گارساں دتاسی مقالہ ۱۸۷۴ء صفحہ ۴۵)

حالی کی نظمیں لوگ "ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور یہ تک بھول جاتے کہ "رات بیت چکی ہے" (ایضاً صفحہ ۳۵)

پنجابی لاہور کے نزدیک:۔

"حالی کی نظم حسب دستور حاصل مشاعرہ تھی سچ تو یہ ہے کہ انھیں کے دم سے ان مجلسوں کی رونق ہے"

(ایضاً صفحہ ۳۵)

جدید شاعری کے اثر سے لکھنؤ بھی متاثر ہوا۔ اور:۔

"نئے قسم کے مشاعروں کی ایک انجمن مظفر علی اسیر کی نگرانی میں قایم ہوئی پہلا مشاعرہ ۱۲ ستمبر کو ہوا جس میں نئے انداز کی غزلیں پڑھی گئیں"

(ایضاً صفحہ ۳۶)

اس انجمن کے قیام سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ میں بھی شاعروں کا ایک طبقہ جدید شاعری کی اہمیت کو محسوس کرنے لگا تھا اور غزلوں میں بھی نیا انداز پیش کرنا ضروری سمجھتا تھا یہ انجمن اودھ پنچ سے تین سال قبل وجود میں آئی تھی، اودھ پنچ نے قدیم و جدید رنگ شاعری کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ مشرق و مغرب کی کشمکش شباب پر تھی، سرسید کی تعلیمی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور ان کے گرد ارباب کمال جمع ہو چکے تھے یہ ارباب کمال نیچری نیے اور سرسید، پیر نیچر، پیر نیچریہ کے حلقہ میں جو بھی داخل ہو جاتا اس پر مخالفت کی بوچھار شروع ہو جاتی۔ یہ مخالفتیں، ادبی تعلیمی مذہبی سماجی، ہر قسم کی ہوتی تھیں۔

حالی نے پیر نیچر کے ہاتھ پر بصدق دل سے بیعت کی تھی اور نیچری مذہب کے وہ سرگرم مبلغ تھے۔ مضامین لکھتے ـــ جلسوں میں نظمیں پڑھتے اور ہمہ جہت، اصلاح کی کوشش کرتے، اخلاق و عادات، مذہب و سیاست ادب و صحافت، کون ایسا موضوع ہے جس پر حالی نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ مخالفین ان کی اس ہمہ دانی کو برداشت نہ کر سکے۔ یہ سراسر ظلم تھا۔ آخرش جب حالی نے گداگری کے خلاف قلم اٹھایا تو گروہ گداگراں نے مقدمہ دائر کیا حالی طلب کئے گئے، ان کا بیان ہوا، بیان پر جرح ہوئی اور

اور فیصلہ ان کے خلاف ہوگیا، اس مقدمہ کی روئیداد بڑی دلچسپ ہے عدالت میں حاضر ہوئے بغیر یہ روئیداد مقدمہ ہدیہ ناظرین ہے۔

گروہ گداگراں بنام منشی نیاز احمد مولف رسالہ خیرات

اظہار مولوی الطاف حسین حالی بحلف

بیان کیا کہ میں قوم کا لیڈر ہوں۔ منشی نیاز احمد صاحب میرٹھی نے جو رسالہ خیرات کے نام سے جاری کیا ہے اس میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے۔ چنانچہ میں اس کی تائید میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے پر اس قدر ردے دے کی ہے کہ بے شمار مرفوع حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی۔

حالی جب یہ بیان دے چکے تو جرح شروع ہوئی۔

وکیل مدعی:۔ مولوی صاحب یہ تو فرمائیے کہ آپ کو مسلمانوں کی قوم کب سے اپنا لیڈر مانتی ہے

مولانا حالی:۔ میں اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوں۔ لوگ مجھے سعدی ہند کہتے ہیں۔ میں نے بہت سی قومی نظمیں تصنیف کی ہیں۔

وکیل مدعی:۔ تو گویا محض شاعر ہونے کی وجہ سے آپ لیڈر شمار کئے جاتے ہیں نہ کہ بحیثیت عالم دینیہ ہونے کے۔

مولانا حالی:۔ میری توقیر و عزت کا بڑا سبب تو یہی ہے مگر میں دینیہ

مسائل سے بھی پورے طور پر واقف ہوں۔

لیل مدعی ۔ آپ نے آج تک جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں ایسی کتنی کتابیں ہیں جو علوم دینیہ پر لکھی گئی ہیں۔

مولانا حالی ۔ میری تصنیفات میں زیادہ تر سوانح عمریاں اور شعر و شاعری کی کتابیں ہیں، دینی مسائل میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

لیجئے جرح ختم ہو گئی۔ اور حاکم کے دستخط ہو گئے۔ حالی نے بھی اپنے دستخط کر دیئے۔

اظہار ایڈیٹر البشیر گواہ ثانی بحلف اور اظہار محمد یعقوب علی بی اے گواہ ثالث بحلف ہو گیا ان دونوں گواہوں کے بعد حاکم نے فیصلہ سنا دیا۔

فیصلہ عدالت :۔

۔ مدعا علیہ اور اس کا طرفدار گروہ سب علم سے ناآشنا ہیں۔ خود مولوی الطاف حسین حالی باوجود مولوی مشہور ہونے کے علم دین سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا ان لوگوں نے جو یہ چال چلی ہے وہ محض علی گڈھ کالج کو خیالی نفع پہنچانے کی غرض سے۔

حکم ہوا کہ

مدعا علیہ مذکور ہمیشہ بقید حیات رہے۔

راقم وجاہت صدیقی جھنجھانوی

(اودھ پنچ جلد بست ہفتم نمبر ۴۱۔ ۸ / اکتوبر ۱۹۳۲ء)

مقدمہ اگرچہ دائر کیا گیا منشی نیاز احمد مولفہ رسالہ خیرات کے نام ۲-۵ لیکن فیصلہ مولوی حالی کے خلاف ہوا۔ اور مقدمہ کی ساری روئیداد میں مولوی حالی کی شاعری، لیڈری اور مولویت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ۲۵ر فروری ۱۹۰۲ء کے پرچے میں اودھ کے رپورٹر نے بھی تندرست سائل کو نکال دو" والی رباعی پر حالی کے خلاف رپورٹ لکھی ہے جو صفحہ ایک کالم تین پر موجود ہے۔ رپورٹر نے ایک نجی خط کو پیش کیا ہے۔ خط میں حالی کی شاعری پر اعتراضات کئے گئے ہیں اور یہ ہدایت کی ہے کہ یہ رباعی چندہ دینے والوں کو خاص طور پر دیکھنی چاہیئے کہ

"دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا ہے"

حالی سرسید احمد کے ساتھ علی گڈھ کالج کے لئے چندہ جمع کیا کرتے تھے یہ ہدایت اس لئے کی گئی کہ چندہ دینے والوں نے ان حضرات کو چندہ دے دے کر مانگنے کا عادی بنا دیا ہے۔

"حضرت حالی ایک اچھے خاصے معلم ہیں۔ استاد بھی کہے جا سکتے ہیں ان کی بندش عموماً پھیکی اور ڈھیلی ہوتی ہے لیکن بڑا افسوس تو یہ ہے کہ میں ان کے وعظ کے رخ سے ہمدردی نہیں کر سکتا" یہ پورا خط اسی انداز کا ہے۔ حالی، نذیر احمد، شبلی سب کا ذکر خیر ہے مشورے ہیں، گذارشات ہیں، حالی کی نیک نیتی پر اعتماد بھی ہے اور خلوص نظری سے انکار بھی۔ آخر میں اس رباعی پر خط کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے

شبلی کا قدم علم کی منزل پہ جما ہے   رفتار پہ آزر کے قلم اس کا لکھا ہے
چمکی ہوئی ہے بزم سلف اسکے بیاں سے   روشن ہو یہ یعنی کہ وہ شمس العلما ہے

اور یہ سب "سیر نیچر" کے سا بعد ہونے کا ثمرہ تھا۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ "نیچرل" کے معنی اور مفہوم اودھ پنچ کے اہل قلم کے نزدیک کیا تھا؟ اور وہ اس کو کس نظر سے دیکھتے تھے حکیم ابو المجد دلشیوی بہاری نے نیچرل لفظوں کی موشگافی اپنی ملیند پروازی سے حسب ذیل کی ہے۔

نیچرل شاعر۔ وہ جو عروض سے نا بلد ہو، قوافی سے انجان ہو، مگر ان لن ترانی کے میدان میں شیر زباں اور ایجاد گندہ پہ نازاں۔

نیچرل شاعری:۔ وہ جو عروض سے نا بلد قوافی سے انجان ہو مگر ان لن ترانی کے میدان میں شیر زباں اور ایجاد گندہ پہ نازاں ہو۔

نیچرل نثاری:۔ وہ جس کی بناوٹ حسن فردوسوں کی کشش رکھتی ہو مگر منہدی کی بھرمار اور غیر مانوس لفظوں کا طومار ہو۔

نیچرل ترجمہ:۔ وہ جس میں خوگیری کی بھرتی ہو، دہقانی جناّت اور وہمی شیاطین کی بولیاں ہوں، اجنبی زبان میں مہمل تاویلیں ہوں اور اس پر ہمچو من دیگرے نیست کی احمقانہ صدائیں

نیچرل تعلیم:۔ الحاد و دہریت کی تربیت، خدا کے وجود سے انکار، پیغمبری سے بے خبری،

نیچرل شریعت:۔ خانہ خدا کی توہین، متقدین پر استہزا، صوم وصلوٰۃ پر قہقہہ، پیغمبران پر مضحکہ، معجزات سے انکار، نواہی پر اصرار عقل وفہم پر ایمان بلکہ جان ودل قربان

نیچرل زندگی:۔ آزاد محض، کسی مذہب وملت کا پابند نہیں، بوقت ضرورت سب درست۔

نیچرل ملا:۔ نیمے دروں، نیمے بروں، نہ نیچرم نہ مسلمان نہ صوفیم نہ جہود، یعنی معجون مرکب، ہر رنگ میں شرابور، جو اس پر بھی نہ رو بچے تو پھر اس سے خدا سمجھے۔

نیچرل شمس العلماء:۔ لکھے نہ پڑھے نام ملا فاضل، چارپائے بروکتابے چند

نیچرل زکوٰۃ:۔ اسپیکروں کی شکم پروری، واعظوں کی حلال خوری۔

نیچرل تہذیب:۔ ابو میاں کو ادلڈ فیلو کا خطاب ہو، نول مین کا القاب ہو، ان کے ملنے سے حجاب ہو۔

نیچرل ترقی:۔ مال مفت کی تلاش، نصف النصف الگ پہنچانیوں کی جستجو، ریفارمری کا ادعا، آنسو بہانے میں یکتا، جدت کا فریفتہ اجتہاد کا شیفتہ، ریفارمیشن کا قائم کرنے کا دلدادہ، مٹی گرنے کا شیدا۔

نیچرل لباس:۔ جاکٹ، پتلون، کوٹ، ہیٹ وغیرہ

نیچرل غذا:۔ وھسکی برانڈی منخنقہ مرغی، گردن مروڑی مرغی)

اسی طرح نیچرل رخصتانہ اور نیچرل صفائی وغیرہ کے معنی لکھے ہیں

(اودھ پنچ جلد بست وہشتم نمبر ۵۲ صفحہ ۵۔ ۲۹، دسمبر ۱۹۰۴ء)

حالی اور ان کی شاعری پر انھیں خیالات کے تحت اعتراضات کئے گئے۔ یہ نیچرل شاعروں اور ان کی شاعری کو ان نیچرل شاعر (UN NATURAL) کیسے تسلیم کرتے، ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ پر اعتراضات کی بوچھار کر دی، غزل، قطعہ، رباعی مسدس، ترکیب بند، غرض حالی نے جس صنف سخن میں جو کچھ لکھا اس پر اعتراض ہوا۔ ان سب کا اجمال بھی، طویل داستان ہے جس کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ وقت! وقت کوتاہ قصہ طولانی، اودھ پنچ کے اس 'بحر ظرافت' سے یہاں چند قطرات ہی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

م۔ ب۔ علیہ الرحمۃ نے حالی کے کلام پر اس طرح تبصرہ کیا ہے۔

"حالی صاحب نہ تو زباندان ہیں اور نہ شاعر مانے جاتے ہیں، ان کا کلام جزو کل شاعری کے عیوب سے بھرا ہوتا ہے اور زباندانی کے کفدست میدان میں وہ وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ بعض اوقات تو بیچارے بھر بھرا کے اوندھے منھ گر پڑتے ہیں۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے معلوم ہو جائے گا۔"

اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہیں رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے اک اک کی بیڑی گر پڑی

اعتراض یہ کیا گیا کہ 'جو ہیں' کے ساتھ 'اور' بالکل خلاف محاورہ ہے

غزل کے اس شعر پر

ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ
دیکھئے برسے گا یا برسائے گا

اعتراض یہ ہوا کہ "برق سے پانی برستا ہی ہے۔ جتنے زباندان ہیں سب برق کو برسنے کے واسطے باندھتے ہیں۔ واہ۔ ایک اور شعر

قانون ہے بنایا یہ ان مقنونوں نے
عالم میں آجکل جو مانے ہوئے ہیں مانا

مانے ہوئے معقول کے ساتھ۔" مانے ہوئے کیا خوب"؟ غرض کہ کہاں تک لکھا جائے پورا دیوان غلطیوں سے بھرا ہے جو شخص ایک شعر بھی صحیح نہیں کہہ سکتا ہے اس کو ساتویں آسمان پر چڑھا دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ دلی کچھ خراد تو ہے نہیں کہ جنم تو پانی پت میں لیا اور دلی میں رہنے سے ترش ترشا کے شاعر ہو گئے۔"

(اودھ پنچ جلد بست و سوم نمبر ۱۱ صفحہ ۶۔ ۱۶ مارچ ۱۸۹۹ء)

مولانا حالی نے تحفۃ الاخوان، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سولھویں اجلاس دہلی میں پڑھی، اس ترکیب بند پر "لائیٹ آف انڈیا نے "قومی نوحہ خواں پر سرسری نظر" کے عنوان سے اعتراضات کئے ہیں۔

"ہمارے مولوی حالی شاعری کے بحرِ ذخار ہیں، بجائے اس کے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے ماہرِ فن تیراک سمجھے جائیں۔

بالکل مرفوع القلم ہیں۔۔ مجھ کو زیادہ تر افسوس اس بات کا ہے کہ وہ شخص جس نے ترقی قوم کا بیڑا اٹھایا ہو اور قوم کی حالت خواہ وہ بری ہو یا بھلی اپنی دردناک آواز میں سناتا رہا ہو، اس نے خود کوئی ترقی اس وقت تک نہیں کی، اور اگر کی بھی تو معکوس جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ شاعری کی جس قدر مشق کی جائے اسیقدر ترقی کرتی ہے، فصاحت، بلاغت، دن بدن کثرت مشق سے بڑھتی جاتی ہے مگر مولانا کے یہاں برعکس، مسدس جس نے مولانا علیہ الرحمۃ کو بام شہرت تک پہنچا دیا دیوان سے ہزار ہا درجہ اچھا ہے۔۔ اور جس قدر نظمیں لکھی ہیں وہ دیوان سے بھی زیادہ خراب حالت میں نظر آتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ نظمیں بیش بہا موتیوں کا ہار ہوں بدنما اور خراب پوت کی لڑیاں نظر آتی ہیں۔

اس تنقید میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ۔

۱. مسدس کی شاعری دیوان سے ہزار ہا درجہ اچھی ہے

۲. مولانا کی متفرق نظمیں اور ترکیب بند، قطعات وغیرہ) جو انھوں نے مختلف موقعوں پر یا جلسوں یا کانفرنسوں کے لئے لکھیں وہ دیوان سے بھی زیادہ خراب حالت میں نظر آتی ہیں نیز یہ کہ :-

۳۔ مولانا حالی نے شاعری میں 'ترقی معکوس' کی ہے۔

شاعری کے لیے یہ اصول بتایا گیا ہے کہ

۱۔ شاعری کی جس قدر مشق کی جائے اسی قدر ترقی کرتی ہے۔

۲۔ فصاحت بلاغت دن بدن کثرت مشق سے بڑھتی ہے۔

یہ اعتراضات غور طلب اور بحث طلب دونوں ہیں۔ کیونکہ بعد کے ناقدین نے مسدس کو حالی کی شاعرانہ بدعت بتایا ہے اور سرسید کے اثر سے پہلے کی شاعری کو بہتر بتایا ہے خود اودھ پنچ میں مسدس اور دیوان کی بحث زور و شور کے ساتھ جاری رہی۔

حالی کی اس نظم میں جو جو غلطیاں صاف اور بیّن ہیں، وہ ہدیہ ناظرین کی گئی لیکن یہاں نمونتہً صرف پہلے بند کے پہلے شعر پر جو گلفشانی کی گئی وہ پیش ہے۔

"دوستو! انکار اگر تم کو ہدایت کا نہیں   عالم اسباب سے ڈھونڈ یا اسے جانو یقیں"

واہ حضرت پہلی ہی بسم اللہ غلط "ہدایت کا نہیں" یہ کہاں کا محاورہ ہے۔ بول چال میں تو "ہدایت سے نہیں" بولتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بضرورت شعر لائے ہیں تو کیا 'سے' شعر موزوں نہ ہوگا۔ جانو یقیں نہیں بولتے۔ مانو یقیں ہو سکتا ہے کیونکہ یقین کرنا، یقین ماننا بولتے ہیں نہ کہ یقین جاننا۔ اگر آپ مانو کہتے تو کیا نقصان تھا۔ مگر کہتے ہی کیوں، آپ تو اردو زبان کو پانی پت کی سنگلاخ زمین پر دوڑانا چاہتے ہیں نہ کہ لکھنؤ اور دہلی

کی ٹھنڈی سڑک پر ہوا کھلانا۔

اسی طرح اس نظم کے ہر بند پر اعتراض ہے جن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیا گیا۔ آخر میں یہ لاریٹ پورٹ آف انڈیا لکھتے ہیں۔

• بادی النظر میں جو غلطیاں واضح تھیں وہ مختصراً ہدیۂ ناظرین کیں۔ یوں تو نظم غلطیوں سے مرصع ہے مگر میں اتنے ہی پر اکتفا کر کے انصاف پسند حضرات سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایسی نظمیں زبان کو ترقی دیں گی اور زبان کا اعلیٰ جوہر مانی جائیں گی اور اسی بول چال اور فصاحت پر کہا جاتا ہے کہ اردو زبان پنجاب میں پہنچ گئی اور پنجابی اسے ترقی دے رہے ہیں بستی کتابیں کم قیمت اور بکثرت رسالے زبان اردو میں نکال دینا اور بات ہے اور زبان کی ترقی فصیح و بلیغ الفاظ میں دینا جس کو خاص و عام قبول کر لیں اور بات ہے:

اس کے بعد صاحب مضمون زبان کی ترقی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لئے کون کون سی باتیں ضروری ہوتی ہیں۔

• زبان ترقی اسی وقت کرے گی کہ جب اس میں فصیح و بلیغ الفاظ تازہ محاورات، نئی بندشیں جس کو عام طور پر سب قبول کر لیں، اضافہ کی جائیں اور ان کی اشاعت بھی بکثرت ہو۔ ورنہ یوں سرسری طور پر کتابوں کے ترجمے جن میں بے معنی اور خلاف محاورہ

الفاظ ہوں، شائع کر دینے سے زبان ترقی نہیں کر سکتی بلکہ اس کے غلط محاورے، بے معنی لفظوں کے استعمال، اس کے قدیم جوہر بلاغت وفصاحت کو مٹا کر اس کو بالکل تبدیل کر دیں گے اور آئندہ چلکر وہ زبان نہ اردو ہی رہے گی اور نہ وہ کہ جو آج کل پنجابی یا مولانا حالی بولتے ہیں بلکہ ایک نئی زبان ہو جائے گی جس کے سمجھنے کے لئے وہی کتابیں کارآمد ہوں گی جو اس زمانے کی تصنیف ہوں"

(اودھ پنچ جلد بست وہشتم نمبر ۱۶۔ ۱۲ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۔ ۲)

ان حضرات کے نزدیک زبان کی ترقی اور بقا کے لیے مذکورہ بالا باتیں ضروری تھیں۔ جبکہ مولانا حالی کے نزدیک زبان کی ترقی وسعت اور بقا کا انحصار کونے کھدروں میں گرے پڑے ہوئے ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے مستعمل الفاظ کو اردو میں استعمال کرنا تھا۔ انھوں نے نظم ونثر دونوں میں ان الفاظ کا استعمال بکثرت کیا ہے۔

حالی کا مجموعہ رباعیات، رحمت اللہ رعد نے کانپور سے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ان رباعیات پر حسب ذیل عنوان کے تحت اس طرح اظہار خیال کیا گیا۔

"رباعیات حالی لطافت سے خالی اور حضرت رعد کی تعریف خیالی"

"جب رباعیات کی شاعری پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بعینہٖ یہ عالم نظر آتا ہے کہ کسی کریہہ منظر ہفتاد سالہ بڑھیا کو نئی نویلی دولہن

کالباس اور زیور پہنا دیا ہے۔ ایک رباعی تمثیلاً ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

دھونے کی ہے اے ریفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تک دھبا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

جو لوگ مولانا حالی کی شاعری پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ وہی ایمان سے کہیں کہ جس کی ایک رباعی میں یوں گودڑ لپٹا ہو وہ کس رخ سے پیچہ بند نہیں شاعر ہے۔ فصاحت ایسی کہ چار مصرعوں میں چار جگہ کپڑوں کا عارضہ موجود ہے رباعی کیا ہے پیر مل کی گودڑ کی ہانڈی یا دھوبی کی لادی ہے۔ ترکیب الفاظ ایسی بانکی کہ باید وشاید۔ خصوصاً رگڑ کا لفظ تیسرے مصرعے میں لطافت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ تلازمہ اور استعارہ ایسا لطیف کہ معلوم ہوتا ہے کہ چرکین کے دیوان سے رباعی نقل کی گئی ہے۔

مولانا حالی بھی اردو شاعری کے ریفارمر ہیں۔ اگر کلام میں یہی طور متحمل رہا تو جو داغ ان کے نزدیک اردو شاعری کے دامن پر ہے وہ نہ رہے گا، نہ دامن رہے گا اور یہ رباعی انھیں کے حال پر صادق آ جائے گی مگر اردو شاعری ایسے حملوں سے

محفوظ ہے، وہ زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

تو پاک باش برادر مباش از کس باک
زنند جامہ ناپاک گازراں بر سنگ

افسوس تو یہ ہے کہ ایسی رباعیوں کی تعریف میں حضرت رعد کرنگ کر فرماتے ہیں کہ یہ

"رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں سے زیادہ کار آمد ہیں۔" چہ خوش چرا بنا شد، اگر دو چار ایسے قدر داں اور پیدا ہو جائیں تو اردو شاعری کے طفیل میں فارسی شاعری بھی درست ہو جائے رعد صاحب شاعری میں خواہ مخواہ کیوں دخل در معقولات دیتے ہیں ... رباعیات کی اور خوبیاں بیان کی ہیں جن کو شاعری سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا اونٹ کو عرق گاؤ زبان سے۔"

عدوئے سامری فن دیکھئے اعجاز رقم میرا
عصا موسیٰ کا ہے تنقید حالی میں قلم میرا

(اودھ پنچ جلد بستہ وہشتم نمبر ۲۱۔ ۲۶ رمئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۔)

مولانا حالی کی رباعیوں کے طرز پر متعدد اصحاب نے رباعیاں لکھنا شروع کر دیں، مرزا آزاد کی ایک رباعی ملاحظہ کے لیے پیش ہے۔

روشن خیال قوم کے ہیں گویا جگنو
تاریکی پہ ان کا رات دن ہلا ہے

اُسکے کریں کیوں نہ انھیں انگشت نما
ان میں نئی روشنی کا دم چھلا ہے
(اودھ پنچ لبست و ہشتم نمبر ۲۲۔ ۲ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

ایک رباعی حضرت دمتیاز کی بھی ملاحظہ ہو۔

ہشیار اے قوم خواب غفلت کب تک
یہ سستی و کاہلی و حسرت کب تک
ہے وقت نیا اٹھو اٹھو بہر خدا
چھوڑو چھوڑو پرانی عادت کب تک

جبکہ ان کے ایک اور ساتھی حضرت ذوا تنا فنان نے اس رباعی میں یہ تعلیم دی۔

جاتا ہے پرانا عہد تسلیم کرو ۔۔۔ آیا ہے نیا زمانہ تعظیم کرو
منظور ہے گر ترقی نسل تمہیں ۔۔۔ بچوں کے لیے اصول تعلیم کرو
(اودھ پنچ جلد پانزدہم۔ نمبر ۴۔ صفحہ ۱۷۔ ۲۲ جنوری ۱۸۹۱ء)

مسدس حالی پر اودھ پنچ کا حملہ نہایت سخت تھا، مسدس میں اسباب زوال امت مرحومہ کے سلسلے میں حالی نے ہر ایک کی قلعی کھولی تھی، اس لئے رند و پارسا، شاعر و ادیب، حکیم و طبیب، مدبر و مصلح، معلم و متعلم، مفکر و فلسفی، غرض سب خفا تھے، مسدس کے جواب میں ایک دو نہیں متعدد مسدس لکھے گئے بڑے بڑے ثقہ بزرگ شاعر بن کر تحفظ اسلام کی خاطر، مسدس کا جواب لکھنے لگے۔

کوئی خالی بنا، کوئی خیالی بنا، کوئی حسرت بنا، کوئی تنقید حالی میں موسوی عصا بن کے آیا۔

مسدس حالی کا نزول لکھنؤ کے مشہور بازار چوک میں ایک کتب فروش کی دکان پر ہوتا ہے۔ خود حضرت خالی شان نزول کے متعلق لکھتے ہیں۔

ظرافت الدولہ فصیح الملک اودھ تیغ بہادر زاد قہقہاتہٗ۔ تسلیم۔
• مولانا جمعہ کے دن رشاید نماز پڑھنے کے لیے گئے ہوں گے۔)
میں چوک میں ایک کتب فروش کی دکان پر گیا تو ایک عجیب کیفیت دیکھی۔ ایک طرف دیکھا کہ ایک نیلے پیلے رنگ کے مسدس کا ڈھیر لگا ہے اور دوسری طرف اسکول اور کالج کے لڑکوں کا جو اس کی خریداری کے لیے جمع ہوئے ہیں ہجوم ہے۔ ہر شخص خرید کرتا ہے اور جو خرید کرتا ہے۔ باغ باغ ہو جاتا ہے۔ گویا دنیا کی دولت ملی ہے، کوئی کہتا ہے " جناب مصنف نے تو وہ زبان پائی ہے کہ چاسر CHAUSAR سے ملا دی ہے جس طرح چاسر نے چھوٹے سکشن الفاظ استعمال کئے ہیں اسی طرح مولانا نے ٹھیٹھ الفاظ کے استعمال میں کوئی دقیقہ تلاش کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔
کوئی کہتا ہے کہ" جناب مصنف نے جغرافیہ کا تو خاتمہ کر دیا ہے مسدس یاد کر لو۔ اور انٹرنس کا امتحان پاس؛
کوئی کہتا ہے کہ" علم تواریخ میں تو مولانا کو وہ عبور ہے کہ

ہسٹری آف گریس اور ہسٹری آف روم تو گویا گھر کی لونڈی ہے۔
کوئی کہتا ہے کہ مولانا نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ ہندوستانی فصاحت
سے جس سے جینٹلمینوں کے دماغ میں خلل آتا ہے اپنے کلام کو ایسا پاک
صاف رکھا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

حضرت حالی طلبا کی تعریف پر سخت متعجب ہوئے کیونکہ انھوں
نے اس سے پہلے کبھی اس کا ذکر نہیں سنا تھا۔ پوچھ ہی بیٹھے جواب ملا:

"آپ نہیں جانتے یہ مولانا الطاف حسین حالی کا مسدس ہے آپ
لوگ پرانے خیال والے جو کچھ کہئے ہم لوگوں کو تو اس قدر مطبوع ہے کہ چھ
مرتبہ طبع ہو چکا ہے مگر ہم لوگوں کی خواہش کم نہیں ہوتی۔ حالی نے جب
وجہ پوچھی تو لڑکوں نے کہا۔

"ہمارے ہندوستان کی شاعری بے جا تعریف اور مبالغہ سے
بھری رہتی ہے لیکن انگریزی شاعری میں یہ دخل عیب ہے۔ ....
ہماری شاعری میں ایک قافیہ کی پخ ایسی لگی ہے جس سے شعراء کا قافیہ
تنگ ہوتا ہے۔ لیکن انگریزی میں بلینک ورس وہ ہے جس میں
قافیہ سے کچھ بحث ہی نہیں۔ مصرعوں کا چھوٹا بڑا ہو جانا عیب نہیں
اگر ایک مصرع
"لگتی ہے جو یاں سے مدینے تلک" ہو تو اس کا دوسرا صرف
.. ... وہ سڑک" کافی ہے۔

الغرض میرے مولانا نے اسی شاعری کی تقلید کی ہے۔ اور

ہر چند قافیہ اور وزن کو تو ابھی چند روز کے لیے رہنے دیا ہے مگر ساری ترکیب وہی ہے اور زبان ایسی پیاری رکھی ہے کہ جس کو ادنیٰ گنوار تک سمجھ لے۔

اب حضرت خالی سننے کے لئے بیتاب ہو گئے وہ چار بند پڑھنے کی فرمائش کی اور صاحبزادے نے دس پانچ بند سنا ڈالے۔ ان بندوں کا سننا تھا کہ ان کو

"متلی آنے لگی۔ کسی گویے کی کھوٹی اکھاڑ تان سنی تھی مگر واللہ کوئی اکھاڑ مسدس نہیں سنا تھا۔ بعض بند تو بالکل سانپ کی جھاڑ اور بچھو کے منتر ہیں۔"

تاہم خالی نے ایک مسدس خرید کر پڑھ ہی ڈالا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ اگر کوئی شخص اس مسدس کو چالیس مرتبہ پڑھے تو یقیناً پاگل ہو جائے۔"

پھر کچھ سوچ ساچ کر لڑکوں کی بھلائی کے لئے دو دن کی کاوش میں بیس بند وہ مسدس لکھے جس کی بندش ایسی اڈلکی کہ دیدار وشاید لفظوں کی نشست گشت زعفران حفظ افیہ کی وہ بھرمار ہے کہ آتش کا ہے کو ہے گرد ارض کا نقشہ ہے تو ارتیخ ہیں تو وہ نام استعمال ہوتے ہیں کہ مولانا کے فرشتے خالی کو بھی غالباً معلوم نہ ہوں گے جس نے اس مسدس کو یاد کر لیا بی اے کے امتحان میں فرسٹ گریڈ یقینی پاس ۔۔ اس لئے یہ ہدیہ مختصر پیش ہے اگر خاطر شریف ہو تو

تو جواب دیجئے، لیکن اپنے ناظرین سے اتنا عاجزانہ ضرور عرض کر دیجیے کہ جو صاحب اسے پڑھیں ہنسیں نہیں یہی شرط ناظرین فروغ اردو کے لیے بھی ہے۔ والسلام

چلا جبلہ، حالی بن ٹھن کے سینر پر | یہ ٹینیز سے دم لیا بانکن پر
لی ٹیکا کا دراز بتوسے نکل کر | لگا دیئے وہ جاکے روڈسی میں چکر

شکم کو جو پایا نہ گدھوں میں ہے
یوں ہی دھو کے ارکھشک میں لیا مزہ تھے

جو ساتھ کا رجے کے ڈپٹ کے تو چپاٹا | جو لوٹا تھا کٹھل وہ کیمپا میں بانٹا
چھا جب ترازی میں اس کو کو نٹا | بڑے زور سے بھائی شاعر کو ڈانٹا

نہ نظم مرصع نہ ہے نثر عاری
الو کھی یہاں شاعری ہے تمہاری

پورے مسدس میں نئی جغرافیہ اور نئی تاریخ نئی زبان اور نئی شاعری کا لطف موجود ہے جس کو میں نے اپنے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ صرف آخری بند پیش کر کے حالی کی خام خیالی کو ختم کرتا ہوں۔

طریقہ آزمائی جو تھا سب کو چپانڈا | گیا پالس انگلینڈ سے رپا ڈانڈا
پڑا عقل پر جس بچارا کا کھانڈا | رہا صرف پھرجن نہ حلوا نہ مانڈا

تمہارے کرم نا سنے نے تم نہ لمٹن
بہت پالی بت ہی میاں گو پال ٹھن ٹھن

زیادہ حد ادب راقم حالی

طریقۂ آبائی کا اشارہ حالی کی اس رباعی کی طرف ہے۔

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی　　بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تونے ہمکو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

(اودھ پنچ جلد بست و پنجم نمبر ۳۹ - ۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲ تا ۹)

کوئی صاحب میر عبرت تھے انھوں نے آئینہ حیرت کے عنوان سے ایک مخمس لکھا جس میں اردو کے عناصر اربعہ (حالی، شبلی، سرسید، اور نذیر احمد) پر دے دی ہے یہ مخمس مولوی اسمٰعیل میرٹھی "کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ" کا چربہ ہے فرق صرف یہ ہے کہ عبرت نے "میرا خدا" کے بجائے روح القدس کر دیا ہے۔ حالی کے متعلق لکھتے ہیں۔

حالی کو ناز تھا مسدس پر　　لیک دیکھا تو محض پوچ و لچر
لکھدیا میں نے ان سے بھی بڑھکر　　رہ گئے جسکو دیکھ کے سب ششدر
کیونکہ روح القدس ہے میرے ساتھ

گرچہ استاد ہیں میرے حالی　　لیک رکھتا ہوں طبع وہ عالی
ہمہ صنعت بے پر و بالی　　دو ہی بیتوں میں جیت لی پالی
کیونکہ روح القدس ہے میرے ساتھ

(جلد بست و ششم نمبر ۱۲ - ۲۷ر مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

مولانا حالی نے ایک الناس نامہ لکھنا شروع کیا تھا جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور شائع بھی نہیں ہوا۔ لیکن اودھ پنچ میں الناس نامہ کی لغات بدو یہ تیار ہو گئی۔

اسلام ۔ شراب خوری، سود خوری، میم بازی، تاش بازی، فٹ بال ٢
میچ بازی وغیرہ
اتحاد ۔ انعقاد جلسہ تکمیل چندہ، برکردن دامن وجیب از روپیہ
و تہی کردن دامن از پیاز و قورمہ
اخلاص ۔ اجتماع جانوراں در میدان لکچر، تحریک لب و زبان مثل
دم سگ وفادار اجنبی و اثبات مثل صحیح الکار
اسپیچ ۔ جوش آوازی، خوش کلامی، خوش غلافی، منہ چکنا پیٹ خالی۔
(رقم از: المجدد دہلوی ہماری جلد بست و ہشتم نمبر ۳۰، ۱۸ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)
ایک اور الفاظ مرکا فی لمبا چوڑا ہے، یہاں اسی پر اکتفا کیا گیا۔

حالی کی شاعری پر مرزا اللہ آبادی کی شاعری بھی خوب ہے۔ یہ شاعری مخمس (مسدس کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے) میں ہے۔ ہر بند کے آخر میں یہ مصرعہ ہے "حالی نے شاعری میں وہ دھبہ لگا دیا" دھبے کی تشریح یہ کی ہے کہ اس نے اردو شاعروں کے دھبوں سے اس دھبہ کو بدنما اور حرکات کیا، اور دھبے کے ادبی گاذروں نے اس کو دور کرنے میں اپنی تمام فنی صلاحیتوں، تجربوں اور کوششوں کو ختم کر دیا۔ لیکن دھبہ نہ چھوٹنا تھا نہ چھوٹا اور یہی بدنما دھبہ اردو شاعری کے سدا رہتے کا ہیکل بن کر پورے ملک کے خیدرباں کی طرح چمکنے لگا جس کی آب و تاب یک دم سے کونے کونے بھی گلی کوچے، کوسے و مشکوے، و بام اور دروازے پر مشہور ہونے لگے جس کا سندر چاندنی اور ٹھنڈی روشنی سے

نفاست پسند نکتہ شناسان لکھنؤ کے قلب و دماغ بھی محظوظ و مسرور ہونے لگے۔

اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا، اسوقت سے لیکر ستائیس اٹھائیس برس تک ہر نمبر میں نہ سہی قریب قریب ہر مہینے میں حالی کی شاعری اور ان کے ادبی کارناموں پر کوئی نہ کوئی مضمون (اعتراض) نکلتا رہا ان کی زباندانی، ان کی اصلاحی کوششوں ان کی علمی کاوشوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا لیکن "سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا"؛ حالی نے اپنے صبر و ضبط سکوت اور خاموشی کی ڈھال پر ان ادبی تیر اندازوں کی فوج کے تیر روکے، یہاں تک کہ ان کے ترکش خالی ہو گئے؛ حالی اپنا کام کرتے رہے۔ ان کا اصلاحی اور ادبی کارواں آگے بڑھتا رہا۔ ان کی پرخلوص صدا لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے لگی۔ اودھ پنچ کے قلعہ (لکھنؤ) کے اندر بھی حالی کی صدا سنی جانے لگی، معترض، معترف بن گئے۔ نام دہرانے والے کلمہ پڑھنے لگے، پانی پت کا یہ ادبی مجاہد اپنے جذبۂ اخلاص و عمل، اپنے سکوت آمیز جوش مسلسل کی بدولت معرکۂ شعر و ادب میں کامیاب و فتحمند ہوا۔ اور پوری قوم نے لسان القوم حضرت صفی لکھنوی مرحوم کے الفاظ میں اعتراف کیا کہ

وہ فخر ادب، ادیب مشتاق ۔۔۔ زخشندہ سیر طبیب اخلاق
یکتائے زماں وحیدہ آفاق ۔۔۔ گر نظم میں فرد، نثر میں طاق

پاکیزہ خیال پاک طینت
جس بزم میں ہو وہاں کی زینت

مسیح الزماں

حالی کے شخصی مرثیے

عظمت رفتہ کے مرثیہ خوان کی حیثیت سے حالی مشہور ہیں ان کی اس شہرت کا سبب ان کا مسدس ہے جس میں انھوں نے اسلام کے گذشتہ کارناموں اور مسلمانوں کی علمی و عملی ترقی کا ذکر کرکے ان کی موجودہ بے عملی، بے حسی اور زوال پر تاسف کیا ہے اس کے علاوہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں (۱۸۹۳ء) جو ترکیب بند انھوں نے پڑھا تھا اس کا مضمون بھی ایک حد تک یہی ہے ایسی نظموں کی نوعیت مرثیوں کی ہے جن پر اس رسالے کے دوسرے مضامین میں اظہار خیال کیا گیا ہے، ان سے موجودہ مضمون کو الگ کرنے کے لئے ہم نے اسے صرف حالی کے شخصی مرثیوں تک محدود رکھا ہے۔

دیوان حالی میں تین ایسے مرثیے ہیں، ایک ان کے بڑے بھائی امداد حسین کا مرثیہ ہے، دوسرا دہلی کے مشہور طبیب محمود خاں کا

اور تیسرا غالب کا۔ خواجہ امداد حسین نے حالی کی پرورش وپرداخت پر کافی توجہ کی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد بڑے بھائی کی حیثیت سے انھوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اپنی استطاعت کے موافق تعلیم دلوائی۔ شادی کی، ایسا بھائی جب موت کے ظالم ہاتھوں اپنے سے الگ ہو جائے تو غم و اندوہ کا وفور ہونا فطری ہے۔ ان کی یاد میں حالی کا صرف بیس شعر کا مرثیہ ہے جو رنج و غم کے شدید احساس سے عاری معلوم ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ کی جذباتی اہمیت اور اس کا صدمہ واضح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کہ سمجھائے اس کی عزیزوں کو دکھائی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آئی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کے مر جانے کی ہے اس کے فنائی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کے پانی

جس بھائی کے آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سایے میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بھلا مہر پدر کو
دی آنچ نہ کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتے بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی
رو لیں گے کبھی سو بار بیٹھیں گے کبھی جہاں میں
پر ناز ہے ہر طرح ہمیں یار لنگھانی
پر آہ دلی دو جو ہے وہ چھائی دل کی
مشکل ہے وہ بیٹھیں بول سکے آپس میں کھلانی
باقی رہے گا داغ اس بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

ان اشعار میں اس کرب و اذیت کا نشان نہیں ملتا جو بھائی کی موت کا تاثر ہونا چاہیے۔ ایسا جان پڑتا ہے حالی اپنے بھائی کا نہیں کسی اور بھائی کا مرثیہ لکھ رہے ہوں۔ حالی کی عمر اسے پہنچ کر ذاتی جذبات سے بڑھ چکی تھی۔ زمانے کی سردی گرمی دیکھتے دیکھتے اس عمر تک رنج میں سنجیدگی کی یہ وجہ ہو سکتی ہے اس سے زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ حالی کا جدید شاعری کا تصور ایک طرح سے نیچرل شاعری کا تصور ہے جو مبالغہ اور استعارے سے پاک ہو۔ اظہار واقعہ اور شاعرانہ واقعیت کا فرق ان کے ذہن میں واضح نہیں ملتا اس لیے وہ جوش اصلاح میں ایسی نظمیں

لکھے گئے تھے جن میں شاعرانہ نمائش برائے نام ہو چاہے تاثیر کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے۔

دوسرا مرثیہ ۵۴ بند کا مسدس ہے۔ ابتدائی ۱۷ بند چہرے یا تمہید کے ہیں جن میں دہلی کی شان و شوکت علمی و تمدنی مرکزیت کا ذکر ہے جابجا سے چند بند پیش کر دینا مناسب ہے۔

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے مہر و رتجہ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں، آئین میں، اوضاع میں اطوار میں
طرز میں، انداز میں، رفتار میں گفتار میں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب
آن کر بستے تھے یاں مٹ مٹ کے جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ و شاب
کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

ان بندوں کا انداز ان کے مشہور مسدس کا سا ہے عظمت ماضی کا ذکر ان کا محبوب موضوع ہے ۔ جب حکیم محمود خاں ایسا نامی طبیب اور با اثر آدمی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو لازمی طور پر دہلی کی پرانی کیفیت، اس کے علمار فضلا اور حکما یاد آجاتے ہیں۔ اور حالی محمود خاں کے مرثیے کے پردے میں دہلی کا مرثیہ لکھنے لگتے ہیں۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ایک ملنسار، خلیق، دوسروں کے کام آنے والا آدمی جو سوسائٹی کی خدمت اپنا مقصد بنا لیتا ہے سوسائٹی کا جز ہو جاتا ہے۔ شہر کی زندگی میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے اور اس کی موت صرف اس کے

خاندان والوں یا دوستوں کا صدمہ نہیں ہوتی بلکہ سارے شہر کا نقصان ہوتی ہے، اس لیئے ایسے موقعوں پر مرثیے کے چہرے کو یہ صورت دینا بہت مناسب ہے فطرت کا تقاضہ ہے کہ ایک نقصان ہوتا ہے تو اس سے ملتے جلتے اور نقصانات بھی ماضی کے دھندلکے سے نکلکر ذہن کے پردوں پر ناچنے لگتے ہیں گزشتہ اہل علم کی یاد، پچھلے ناموروں کے کارنامے سامنے آنے لگتے ہیں

ہوگئے تیرے محدث راہیٔ دارالسلام
کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہوگیا دنیا سے رخصت تیرا جاہ و احتشام
رفتہ رفتہ ہوگئی سب صاحبی تیری تمام
مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب
جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کو کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اس کو بھی لے دلی بہا

اس بند میں متوفی کے فضائل کی طرف گریز کی بڑی اچھی صورت نکالی ہے جس کے بعد حکیم محمود خاں کی نبض شناسی عبورِ علمی اور غربا پروری کا بیان کیا ہے جس سے طب میں ان کی مہارت اور ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دار الشفا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا

مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانے کا تھا اس کو نہ شکرانے کا تھا

اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

سر جنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال و حیل
آگیا تھا دانتوں میں زود اعتقادوں کے خلل

ویں مگر اس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل
طب یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل؛
سلطنت اندر عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اس کے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ
رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر
کرتے ہیں معلوم جو جو ان سے امراضِ بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر
اس کی اس انگلی پہ تھے قربان سو تھرمامیٹر
نارسا تھیں وہ دوربینیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دوربیں اس کی وہاں
شہر کے سب مرد و زن، پیر و جواں، خرد و کلاں
تھے قوی پشت اس سے ایسے جیسے پشتے سے مکاں
جس کو نسخہ دیدیا لکھکر وہ یہ سمجھا کہ ہاں
زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یاں
گو کہ ماتم ملک میں ہے اس کا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

حکیم محمود خاں بھی ایسے لوگوں میں تھے جو اپنے پیشے کے علاوہ اور مشاغل میں بھی منہمک رہتے اور خدمت خلق کے موقع نکالتے رہتے ہیں۔ وقت پڑنے پر دوستوں کے کام آنا، ایمانداری

امانتیں رکھنا اور وقت پر انھیں واپس کرنا، اپنی وضع پر قائم رہنا۔ حق گوئی، بے باکی وغیرہ دوسرے محاسن انسان کی شخصی زندگی کا جزہیں انسانی تصویر میں اگر ان رنگوں کی جھلکیاں ہوں تو وہ دلکش اور قابل قدر ہونے کے ساتھ ہر دلعزیز اور محبوب بن جاتی ہے، حاذق طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم محمود خاں کے دوسرے اوصاف کا ذکر بھی حالی نے کیا ہے اور غدر کے آشوب میں ان کے خدمات کو سراہا ہے۔

محرم و بے جرم میں تھا حاکموں میں اشتباہ
عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیتا نہ دورتھے سب گواہ
پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ
ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اس نے کی
اہل دہلی اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی
بانفسہٖ جن مجرموں کو اس نے سمجھا بے خطا
ماحصل لا میں ثبوت ان کا صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا ایک ایک رہا
جو کہ تھے نادار کی ان کی اعانت برملا
زر دیا، کھانا دیا، کپڑا دیا، بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

جن کی عنقا تھی دیانت ہیں ابنائے زماں

تھی امانت جس کی اس کے پاس ملکی یا گراں

موت میں پاس اپنے رکھا اس کو مثل پاسباں

کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں

ایک عالم ناخدا ترسی میں جب بے باک تھا

اس کا دامن تھا کہ ہر دھبہ سے بالکل پاک تھا

صدمہ سے آدمی مایوس و مغموم ہو ہی جاتا ہے اس کے دل پر ناامیدی کے بادل چھا جاتے ہیں۔ مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے اسی لئے حالی بھی حال کے غم سے نڈھال ہو کر مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں، زندگی کو بڑھتی اور پھیلتی ہوئی قوت ماننے کے باوجود انھیں قومی افق پر اندھیرا نظر آتا ہے اور وہ شکستہ دلی سے پکار اٹھتے ہیں۔

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا

مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

ان کے مرثیوں میں فریاد و آہ زیادہ نہیں۔ وہ متوفی کے محامد و فضائل بیان کر کے اس قومی نقصان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس کی موت سے ہوا ہے، سماجی نقصان کی اہمیت ان کے دل میں شخصی نقصان سے زیادہ ہے غالباً اسی وجہ سے وہ اپنے بھائی کے مرثیے میں وہ بات نہیں لا سکے جو محمود خاں کے مرثیے

میں ہے خواجہ امداد حسین کی موت سے حالی کی گھریلو زندگی میں خلا پیدا ہوا تھا لیکن محمود خاں کی موت نے دہلی کی سماجی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ خواجہ امداد حسین کی موت حالی کا شخصی نقصان تھا جبکہ حکیم محمود کی موت دہلی کا سماجی نقصان — اور اپنے سماجی شعور کی بیداری کے باعث حالی محمود خاں کی رحلت کو ادب کے لئے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

ایسا ہی جذبہ غالب کے مرثیے کا بھی محرک ہے۔ حالی غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے " یادگار غالب" سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف غالب کی شاعری کی عظمت کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت سے بھی بہت متاثر تھے اور انھیں بہت عزیز رکھتے تھے ہمارا خیال ہے کہ غالب کے مرثیے میں ذاتی تعلقات کے اشعار سے صرف ان اشعار میں ہیں۔

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں

لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں

کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل

کس سے دادِ سخنوری پائیں

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے　　جا کے دلی سے آئے گا اب کون
شعر میں نا تمام ہے حالی　　غزل اس کی بنائے گا اب کون

شخصی غم کے نشانات برائے نام ہونے کی وجہ بھی ہمارے نزدیک حالی کا سماجی شعور ہے اپنے غم کے ساتھ انھیں قوم کا خیال آجاتا ہے ادبی دنیا کا وہ خلا سامنے آجاتا ہے جو غالب کی موت نے پیدا کر دیا۔ اس لئے ذاتی صدمہ کو پس پشت ڈال کر انھوں نے اس قومی نقصان کی طرف اشارے کئے ہیں جو اس حادثے کا نتیجہ تھے۔ تمہید میں دنیا کی بے ثباتی اور حقارت کا مضمون ہے۔ ایک عزیز شخصیت کو آن کی آن میں مٹی کا ڈھیر بن جاتے دیکھکر دنیا سے آدمی کا دل سرد ہو جانا فطری ہے ہر چیز اسے بے حقیقت نظر آتی ہے اس تمہید کے بعد ہی غالب کی موت کا ذکر آجاتا ہے اور ان کے کردار کی خوبیاں اشاروں میں بڑی اچھی طرح بیان کی گئی ہیں۔

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس　　پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج　　رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول　　سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

خاکساروں سے خاکساری تھی　　سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ　　دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

ریائی تھی نہ زہد کے بدلے　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ے پیمانہ تھا مست و خراب　　ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا
مظہر شانِ حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

کردار کے ان پہلوؤں کو واضح کرنے میں حالی نے بڑی ذہانت اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ غالب کی خصوصیتیں بھی واضح کر دی ہیں اور بے ادبیانہ مدح کا راستہ بھی اختیار نہیں کیا۔ بظاہر چند مصرعے ہیں لیکن ہر شعر ان مصرعوں کا بڑی ناپ تول اور غور و فکر کا نتیجہ دیتا ہے شخصیت کے بعد ان کی ادبی اہمیت کا بیان اس طرح کیا ہے۔

نثر حسن و جمال کی صورت　　نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر　　تعزیت اک ملال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں　　نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی　　شکل امکان محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی　　رنگ ہجران وصال کی صورت

بعد کے بند میں ان کی ادبی خوبیوں کا ذکر اس سے زیادہ احساس سے کیا ہے ان اشعار میں ایسی شخصیت کے مٹ جانے پر دلی صدمہ اور سماجی نقصان کا بیان ہے جس کے بعد صحیح معنوں میں محفل شعر سونی ہو گئی۔

نقد معنی کا گنج داں نہ رہا — خوان مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن — اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا ایک ایک کارواں سالار — کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اس کا — گرم بازارِ گل رخاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں — گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

بعد کے بند میں احساس کی شدت اور تیز ہوگئی ہے۔ استعاروں کی مدد سے حالی نے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں لمبے مضامین ادا کر دیئے ہیں اور علامتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے ترکیب بند میں غزل کی جزالت اور اشاریت سے کام لے کر حالی نے اس صنف کا ایک لازوال نمونہ تیار کر دیا ہے۔ یہی معنویت اور اشاریت اس مرثیہ کی جان ہے۔

شہر سارا بنا ہے بیت حزن — ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی — ڈھونڈتے کیا ہو سیب و رماں میں
حصر تھی اک بیان میں رنگینی — کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش — گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں گلستاں میں

اور اس کے بعد کے بند کے لیے حالی نے جو ردیف منتخب کی ہے وہ ان کی شاعرانہ مہارت، لفظوں کے ترنم اور اثر کے رشتہ پر ان کا عبور واضح کرتی ہے۔ مرثیے کے اختتام میں حسن

درد، دکھ اور جذبات کے پورے اظہار کی ضرورت ہے وہ اس آخری بند میں موجود ہے۔ تعریفیں ہوچکیں، محامد و فضائل کا بیان ہوچکا۔ کردار کے اچھے پہلو گنوائے جاچکے۔ استعارۂ دل میں شخصیت کی علمی و ادبی عظمت جتائی جاچکی پھر بھی دل کی بھڑاس غم کے واضح اظہار کے بغیر نہیں نکلتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے کے نو بند دماغ سے نکلے ہیں لیکن آخری بند میں دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ ان میں منطق نہیں فلسفہ نہیں، شاعری کی صناعی نہیں دل کی آواز ہے۔

شہر میں نام پائے گا اب کون — سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم سے خالی ہے اس سے قدر ملف — ان پہ ایمان لائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائیگا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش — وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے ہیں — جاکے دلی سے آئے گا اب کون
مرگیا قدر دان فہم سخن — شعر ہم کو سنائے گا اب کون
مرگیا تشنۂ مذاق کلام — ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
تھا بساط سخن میں شاطر ایک — ہم کو چالیں بتلائے گا اب کون

شعر میں نا تمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

یہ دل کی فریاد مرثیہ کا اہم جزو ہے اور غالب کا مرثیہ

اس لیے نہ صرف حالی کے مرثیوں میں بلکہ اردو کے تمام شخصی مرثیوں میں ممتاز ہے کہ اس میں حالی نے سماجی نقصان اور شخصی عظمت کے بیان کے ساتھ ساتھ دلی جذبات کا بھی خیال رکھا ہے اور ایک حد تک اس کے اظہار کا موقع بھی نکالا ہے بزرگی کا اعتراف کرنے، اہم خدمات کو سراہنے اور بلندیوں کا قائل ہونے سے عقلی اعتبار سے آدمی کو اطمینان ضرور ہو جاتا ہے لیکن تسکین نہیں ہوتی۔ منطقی دلائل سے انسان کو قائل کر کے چپ تو کیا جا سکتا ہے لیکن جذباتی معاملات میں تشفی اور تسکین اسی وقت ہوتی ہے جب اس کی فطرت کا تقاضہ پورا کیا جائے۔ اور وہ ہے آخر میں جذبات کا اظہار، متوفی کی غیر موجودگی کا صدمہ جسے حالی نے آخر میں ظاہر کر کے فن کی نزاکتوں کو پورا کیا ہے۔

صالحہ عابد حسین

چپ کا دادرس

حالی کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت دردِ دل ہے جس سے
ان کا دیوانِ شعر بھرا ہوا ہے۔ ان کا یہ شعر

چیست انسانی طپیدن از غمِ ہمسائگاں

سموم ... غنچہ عدن پژماں شدن

محض برائے گفتن نہیں بلکہ ان کے دل کی آواز اور زندگی کا اصول بھی ہے
ان کی زندگی بھر کے کارناموں کے پس منظر میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا
ہے۔ قوم کو بدحال، مفلس، جاہل، بے عمل، تنگ نظر، متعصب اور قدامت
پرست پاکر ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اس کو اس بدحالی اور تباہی
سے نکالنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ ادب اور شاعری (جس کو وہ
انسانی تہذیب اور تعلیم کا بہترین آلہ سمجھتے ہیں) جب تصنع اور آورد کا دلدادہ
تقلید کا پابند عمل کی تعلیم اور علم کے درس سے بیگانہ، فراری اور غیر افادی
پاکر اس کی اصلاح کا فرض ادا کرتے ہیں۔ صحیح تنقید کا فقدان پاکر اس کے

نمونے پیش کرتے ہیں۔ چھوٹی مذہب پرستی، تنگ نظری اور تعصب کے خلاف جہاد کرتے ہیں.......... غرض زندگی کے میدان میں جہاں کہیں انھیں کوڑا کرکٹ، گندگی، گڈھے اور کھائیاں نظر آتی ہیں ان کو پر کرنے اور صاف کرنے کی جد وجہد میں لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ مختصر اور جامع تبصرہ حالی کے کاموں کی بڑی صحیح تصویر پیش کرتا ہے کہ " تاریخ سیاسی میں تاریخ تعلیمی میں تاریخ معاشرت میں تاریخ ادب میں جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محب وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوش ذہنی سے جا ملتا ہے....." جس کا نام حالی ہے۔ اور اگر اس میں اتنا اضافہ اور کر لیا جائے کہ ہندوستانی عورت کے حقوق اور اصلاح کا سب سے پہلا قدم اٹھانے والی ہستی بھی حالی ہی کی ہے تو یہ تعریف مکمل ہو جائے گی۔

یوں تو حالی نے تقریباً ساٹھ سال تک ملک و قوم، ادب اور شاعری، سماج اور تہذیب کی خدمات انجام دیں مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میدان میں وہ تنہا تھے۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں کئی ایسی بے غرض شخصیتیں قوم میں پیدا ہو گئی تھیں اس راہ میں حالی کی ہم نوا اور ساتھی تھیں اور جنھوں نے اپنی ساری زندگیاں قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں۔ ان قابل قدر ہستیوں میں سرسید کی ذات سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتی ہے لیکن اصلاح اور خدمت کے اس میدان کا ایک گوشہ ایسا تھا جو سرسید کی

سے چوک گیا لیکن حالی کی دوربیں نگاہ سے وہ نہ چھپ سکا اور انھوں نے اس یک گوشے کو منور کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یعنی عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور ن کی تعلیم کے لئے جدوجہد کرنے کے کٹھن، صبر آزما اور انتہائی اہم کام کا۔

یہ صحیح نہیں کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے انھوں نے عورتوں کی تعلیم یا حقوق کے لئے کچھ نہیں یا اور قوم کے آدھے حصے کو مفلوج رہنے دینا گوارا کر لیا۔ وہ غالباً یہ سمجھتے تھے کہ جب مرد تعلیم پا جائیں گے تو عورتیں بھی آگے چل کر تعلیم حاصل کرنے لگیں گی۔ لیکن حالی کی چشم بینا نے دیکھا کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک سچے معنوں میں ترقی کر ہی نہیں سکتی جب تک اس کی عورتیں بھی زیور علم سے آراستہ نہ ہوں اور ان کو انسانیت کے سارے حقوق نصیب نہ ہوں۔

عورت کی دردناک اور زبوں حالت دیکھ کر حالی کا حساس دل تڑپ اٹھا اور صدیوں کی حق تلفیوں کے بعد عورت کے حق میں جو پہلی بلند آواز سنائی دیتی ہے وہ الطاف حسین حالی کی ہے۔ اور پھر کچھ عرصے بعد ہندوستانی عورت کے حق میں دوسری مقدس آواز مہاتما گاندھی کی بلند ہوئی یہ دو ہستیاں اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق عورت کو انسانیت کے اونچے معیار پر پرکھتی اور اسے انسانیت کے سارے حقوق مرد کے مساوی دینا چاہتی ہیں۔

حالی نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور ابتدا میں ان پر رسمی مذہب کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن علم کی وسعت اور نظر کی گہرائی نے ان کو رفتہ رفتہ

مذہب کی سچی تعلیم کو سمجھنے اور اسلام کی روح کو اپنانے کی صلاحیت پیدا کی اور اسی کی وجہ سے ان کے دل میں عورت کے درجہ کا احساس، حقوق کی حمایت کا جذبہ اور اس کی بدحالی کا اندازہ ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ اسلام نے عورت کو جتنے حق عطا کئے ہیں وہ مرد کی خود غرضی نے چھین لیے ہیں جس ہستی کو سب سے پہلے علم کی روشنی پہنچنی چاہیئے، جو مذہب کی صحیح اسپرٹ قبول کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے، اسے جہالت کے اندھیرے میں ٹاپک ٹوئیاں مارنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے اور محض باندی گیری اس کا مقصد حیات سمجھ لیا گیا ہے۔ عورت کی شخصیت کا یہ قتل، اس کی ہستی کی یہ پائمالی اس کی مظلومی کی یہ مسلسل داستان حالی کے دردمند دل کو تڑپا گئی۔ اور انھوں نے اس کے خلاف جدوجہد کرنے کی ٹھان لی۔

حالی صاحب قلم تھے ان کا اصلی مقام اس میدان میں قلم آزمائی کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ لوگوں کے ذہن شعر و ادب سے کتنے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اصلی جدوجہد تو قلم ہی سے کی لیکن عملی طور پر بھی عورت کی ترقی اور اصلاح کا کام کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے۔

کسی حکیم کا قول ہے کہ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔ حالی نے بھی ایک سچے مصلح کی طرح سب سے پہلے اپنے خاندان کی عورتوں کے حقوق دلوائے اور ان میں تعلیم کو رواج دیا۔ ہمیں ان کے خاندانی حالات اور روایات کی جانچ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے زمانے میں ان کے گھرانے میں بہت سی "بدعتیں" شروع ہو چکیں تھیں جو اس وقت کے شریف خاندانوں

میں بہت معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ جائیداد میں لڑکی کا حصہ، شادی کے وقت لڑکی کی پسند اور رائے کا پاس، بیوہ کی شادی، پڑھنے لکھنے کا رواج وغیرہ۔ اور صرف اپنے گھرانے ہی میں نہیں اپنے دوستوں اور شہر والوں کو بھی وہ اس کی تلقین کرتے رہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی کوشش پہلے تو انفرادی طور پر ہوتی رہی اور انھوں نے اپنی پوتیوں اور نواسیوں پر لکھنے پڑھنے کی تاکید کی۔ ان کے لئے اچھی اچھی کتابیں فراہم کرتے۔ ان کو آسان اور دل نشین انداز میں خط لکھتے اور ہر طرح سے ان میں تعلیم کا شوق پیدا کرتے۔ ان کے بیٹے اور نواسے وغیرہ جو علی گڑھ کے پہلے گریجویٹس میں سے تھے، ان کے اس معاملے میں سرگرم مددگار رہتے۔

۱۸۹۴ء کے لگ بھگ بڑی تلاش اور کوشش کے بعد ایک استانی میسر آئی تو حالی نے اپنے مکان سے متصل لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ انکے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین جو اس وقت انسپکٹر مدارس تھے۔ (اور قومی درد اور لگن باپ سے ورثے میں پائی تھی) اس اسکول کے مشیر، مددگار اور مالی کھیل تھے۔ یہ چوتھی جماعت تک کا اسکول تھا جس میں لڑکیاں علاوہ مذہبی تعلیم اور خانہ داری اور دست کاری وغیرہ کے، اردو لکھنا پڑھنا تھوڑا بہت حساب کتاب، تاریخ جغرافیہ بھی سیکھتی تھیں۔ اس اسکول کی تعلیم کا معیار خاصا اونچا تھا۔ حالی کے خاندان کی، دوستوں کی، اور معتقدین کی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں اور ان کی آسانی اور آرام کا حالی بڑا خیال رکھتے تھے لیکن چند سال بعد یہ اسکول بند کرنا پڑا۔ غالباً

کسی مناسب استانی کی نایابی اس کا اصلی سبب تھی۔ بقول خود حالی کے "تھوڑے عرصے میں لڑکیاں استانی کے برابر ہو گئیں بلکہ بعض اس سے بڑھ گئیں"۔ مالی مسائل کی کمی بھی شاید حارج ہوئی ہو۔ لیکن اس کی وجہ سے پانی پت میں عورتوں کی تعلیم کا جو چرچا ہو گیا تھا، وہ ختم نہیں ہوا اور دیے سے دیا جلتا رہا۔

حالی جہاں کہیں لڑکیوں کے اسکول دیکھتے (قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان لڑکیوں کے ہی ہوں) بہت جوش ہوتے تھے۔ اپنے ایک مضمون میں مہاراجہ الور کی تعلیمی سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "چودہ مدرسے زنانے بھی ہیں جنمیں ہندو مسلمان دونوں قوموں کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں .... " ایک اور مضمون جو چھپتے ہیں یا مر گئے ہیں لکھتے ہیں "اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے .... مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی اور بناتی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے"۔

انھیں اس کا احساس اور اندازہ تھا کہ ہندوستان میں دوسری قومیں اپنی عورتوں کی تعلیم کی طرف مسلمانوں سے زیادہ متوجہ ہو رہی ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی حالت سنبھلنے لگی ہے۔ اور خود مسلمان جن کے مذہب کا حکم ہے کہ وہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے" اور جس مذہب نے علم ہر "مومن کی کھوئی ہوئی پونجی" قرار دیا ہے اور ہر مرد اور ہر عورت کو تحصیل علم کا یکساں حکم دیا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف سے یکسر غافل بلکہ مخالف ہیں۔ اور اگر کہیں رواج ہے بھی تو وہ صرف رسمی مذہبی تعلیم کا جس میں توتے کی طرح رٹ لینا ہی علم سمجھا جاتا ہے۔ وہ بیشک مذہب اور مذہبی تعلیم کے سچے پرستار تھے۔ لیکن ایسی سطحی تعلیم کو ضرور ناکافی سمجھتے تھے اور پھر ان کا

خیال تھا کہ صرف مذہبی تعلیم ہی سے کام نہیں چلے گا بلکہ زمانے کا تقاضہ یہ ہے
کہ مسلمان عورت دوسرے علوم بھی حاصل کرے تاکہ اپنے خول سے نکلے اور
علم و عمل کے میدان میں اپنا مقام حاصل کرے۔ ایک مضمون میں آریا سماج
اور مسلمان عورت کی حالت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ایک سہولت
آریا سماج کو ہندو عورت کی حالت کے سبب ہے جو مسلمان عورت کی حالت
سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو عورتوں میں جو آریا سماج کے ممبروں سے تعلق
رکھتی ہیں زمانہ حال کی تعلیم زیادہ رواج پاتی ہے۔ برخلاف مسلمان عورتوں
کے جن میں اگر کچھ تعلیم ہے بھی تو صرف قدیم طریقے کی طرح کی مذہبی تعلیم جس سے
کسی قدر نوشت و خواند کی لیاقت یا نماز روزے وغیرہ کے مسائل سے
فی الجملہ واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ باقی جو خیالات متعلق بہ اصلاح رسوم
و عادات ان کے رشتہ دار مردوں کے دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں۔
ان سے وہ ایسی ہی بے خبر اور اجنبی ہوتی ہیں جیسی محض جاہل عورتیں۔۔۔"
حالی کی روشن خیالی اور وسیع النظری کا ثبوت ان کی زندگی بھر کے کارنامے
اور تقریر و تحریر سے ملتا ہے لیکن پھر بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ انیسویں
صدی کے آدمی تھے۔ ان کے خیالات کو ہم آج کل کی کسوٹی پر نہیں پرکھ
سکتے۔ وہ عورت کے حقوق اور آزادی کے اس حد تک حامی تھے جہاں تک
اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔ اگرچہ وہ ہندوستانی قید و بند والے
رواجی پردے کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اسلامی پردے کے سختی سے حامی
تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رواجی پردے کی سختی مسلمانوں نے ہندوستان آکر

سیکھی اور یہ پردہ یقیناً عورت کے حصول علم و وسعت خیال میں حارج ہے۔
اس متذکرہ بالا مضمون میں آگے چل کر یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں میں اصلاح رسوم کیوں اس قدر مشکل ہے لکھتے ہیں۔ .... "اس کے سوا جن قوموں میں پردے کا رواج ہوتا ہے ان میں عورتیں بیاہ شادی اور دیگر رسوم پر زیادہ شیفتہ و فریفتہ ہوتی ہیں کیونکہ ان کی تمام خوشیاں اور امنگیں اور چاؤ انھیں باتوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کنبے یا برادری کی عورتوں کو کس حیلے یا بہانے سے گھر بلا کر ایک دوروز ان کے ساتھ ملنے جلنے ہنسنے بولنے اور ان کی خاطر تواضع کرنے سے اپنا دل خوش کریں.... ... جس قوم میں عورتوں کی تمام خوشیاں اور امنگیں انھیں باتوں پر منحصر ہوں ان کے مرد کیوں کر اصلاح طرز معاشرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں.........."
بظاہر اس میں رواجی پردے کی مخالفت نہیں لیکن یہ پیش نظر رکھیے کہ بحث اس پر ہے کہ ہماری معاشرت کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور ان رسوم و تقریبوں کی وہ مذمت کر رہے ہیں جو بے تحاشا ہمارے گھروں میں رائج تھیں، تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ ایک اور مضمون "کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں" میں اس مسئلے سے بحث کرتے ہوئے کہ بغیر مذہب سے روگردانی کئے بھی وہ میدان ترقی میں گامزن ہو سکتے ہیں لکھتے ہیں۔
"اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے تجاوز ہوتے ہوتے ایک طومار طویل الذیل ہو جاتا ہے........ لیکن جب

زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے ٦
قصے کہانیاں...... بہت سے رسم و رسوم...... جو امتداد ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں ان سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں.. ... مثلاً ہندوستان کا ایک شریف مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلاف شرافت ہی نہیں خلاف شریعت بھی جانتا ہے جب اہل وعیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا۔ ...... " اس ٹکڑے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے رواجی پردے کو جس میں عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید کر دیا جاتا ہے وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے اور صرف اسلامی پردے کے حامی تھے جس میں عورت برقعہ یا چادر اوڑھ کر دنیا کے سب کام انجام دے سکتی ہے۔

حالی صرف عورت کے حقوق کے حامی ہی نہیں تھے بلکہ وہ اس سے بھی واقف تھے کہ صدیوں کی جہالت اور غلامی کی زندگی نے اسے ناکارہ کر دیا ہے اور اس میں توہمات و رسم پرستی قدامت پسندی اور تنگ نظری پیدا ہو گئی ہے۔ نہ وہ دنیا سے واقف ہے نہ اپنے فرائض سے پوری طرح آگاہ ہے۔ نہ بچوں کی تربیت اور تعلیم کے بنیادی مسائل ہی کو جانتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ خود عورتوں کو بھی اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہو اپنی تعلیم کی طرف توجہ کریں اور بچوں کی پرورش اور تربیت صحیح اصولوں پر کر سکیں۔

اس مقصد کو مدنظر رکھ کر انھوں نے مجالس النساء تحریر کی تھی۔ یہ قصے کے پیرائے میں لکھی ہوئی ایک بڑی سبق آموز مگر دلچسپ کتاب ہے۔ پہلے حصے میں حالی نے آتو جی اور زبیدہ خاتون کی زبان سے لڑکیوں کی تربیت کے ڈھنگ اور تعلیم کے اصول بتائے ہیں اور دوسرے میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے گر بتائے ہیں۔ آج یہ کتاب کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہے اور آج کل کے تعلیم یافتہ مرد کیا عورتیں بھی اس کے نام تک سے ناواقف ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالی نے اپنے سیدھے سادے دلنشین انداز میں تعلیم تربیت کے جو اہم اور زریں اصول ستر برس پہلے بتائے تھے وہ آج بھی اتنے ہی مفید اور ضروری ہیں۔ وہ بچوں کی نفسیات سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی ایسی ایسی پتے کی باتیں اور نفسیاتی اصول سمجھا گئے ہیں جو ماہرین نفسیات بھی کم ہی بتاتے ہیں۔ پھر انداز بیان ایسا دل نشین اور پر اثر ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن پر وعظ کی خشکی اور نصیحت کی تلخی گراں نہیں گزرتی یہ کتاب خاص طور پر نہایت سہل سادہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ جس میں عورتوں کے محاورے روزمرہ۔ کہاوتیں مثلیں اس خوبی سے آئی ہیں کہ کسی طرح پتہ نہیں چلتا کہ یہ کسی عورت کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اس کتاب کو پنجاب کے محکمہ تعلیم نے چار سو روپیے کا انعام بھی دیا تھا اور مدت تک یہ پنجاب کے زنانہ مدارس کے نصاب کورس میں شامل رہی۔ میرے بچپن تک یہ کتاب عورتوں میں مقبول تھی۔ اگر لڑکیوں کے مدرسوں کے درسی کورس میں پھر اس کو داخل کر لیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ بہت سی ان کتابوں سے

زیادہ مفید ثابت ہوگی جو آج کل خانہ داری یا بچوں کی تربیت کے موضوع پر داخل نصاب ہیں۔

نثر سے بھی زیادہ زور، جوش، خلوص اور شدت کے ساتھ حالی نے نظم میں عورت کے لیئے آواز اٹھائی ہے۔ ایک چھوٹی سی نظم انھوں نے ہندوستان میں لڑکیوں کی ناموزوں شادیوں پر لکھی ہے جس میں بتایا ہے کہ نالائق بر ملنے سے ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا..... آج بھی وہی ناشدنی رسم دوسری شکل میں باقی ہے کہ انھیں زندہ در گور کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے اس کے دو تین شعر دیکھئے ؎

چھان بین اسکی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو — پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہے بر
بدمزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بد چلنی — کچھ برائی نہیں ذو تنا ہے داماد اگر
یہ وہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن — بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام — جاہلیت سے کہیں ہے یہ زمانہ بدتر

لیکن حالی کی شاہکار نظمیں جس میں انھوں نے عورت کی حمایت اور تعریف میں قلم توڑ دیا ہے، چپ کی داد اور مناجات بیوہ ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان کی کتنی اچھی تعریف کی ہے۔

"مناجات بیوہ اور چپ کی داد دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا کسی زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعہ سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے

ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا...."

چپ کی داد اعتراف ہے عورت کی عظمت، خدمت، ایثار اور قربانی کا اور بیوہ کی مناجات فریاد ہے اس کی مظلومی اور مصیبت پر حالی نے جس خلوص، جوش، احترام اور محبت کے ساتھ اس کی صفات کو سراہا ہے اس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی ادب میں مل سکے۔

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے — ملکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو — ہو دین کی تم پاسباں ایمان سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا — گھٹی میں ہے صبر و رضا، انسان عبارت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم لاچار کی — دولت ہو نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتوں لے دے کے ست اب تم سے ہے

عورت کی ان انمول صفات کو اس جوش اور خلوص دل سے اس سے پہلے (یا بعد) اور کس نے سراہا ہے؟۔ وہ اس کی ہر ہر خدمت اور ایثار کا تذکرہ کرتے ہوئے جو وہ بیٹی، بہن، اور بیوی کی حیثیت سے کرتی ہے۔ ماں کے درجے اور خدمات پر آتے ہیں گے۔ ماں کی عظمت اور ایثار کا ذکر تقریباً ہر قوم اور ہر ادب میں آیا ہے۔ مگر حالی نے جس انداز سے اسے سراہا ہے ذرا وہ بھی دیکھیے

یقیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں لیں — خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہوتا یہ جہاں
تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا — آخر یہ ان دکھیاریوں خدمت تمھارے سر پڑی

پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ نکلتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

اور پھر اعتراف کرتے ہیں!

وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نور حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسماں
کیا صوفیان باصفا کیا عارفان باخدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث کیا قطب زماں
یہ پھول ہیں سب انھیں کی گود پروردوں کے نہ تھے
سینچا تھا ان نے جنھیں خون جگر سے اپنے یاں

پھر ان کی مظلومی کی زندگی کی داستان سنانے اور اس پر جو ظلم اور سختیاں روا رکھی گئی ہیں ان کو دہرانے کے بعد اس کے صبر و ایثار کو سراہتے ہوئے اسے نوع انسانی کا شرف قرار دیتے ہیں ؎

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے بسر
زیبا ہے گر کہیئے تمھیں فخر نوع بشر

لیکن حالی کا حساس دل اس خیال سے داغ داغ ہے کہ وہ ہستی جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہے اور جس کے دل میں ایمان و حق کو قبول کرنے کی فطری صلاحیت موجود ہے، اسے اور سب باتوں کے ساتھ ساتھ علم کی روشنی تک سے محروم کر دیا گیا۔

تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں ہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمھاری کچھ خبر
[illegible] جیسی [illegible] ویسے ہی محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر

اور یہ حقیقت بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں کہ عورت کو علم کی دولت سے

محروم رکھنے کی وجہ کیا ہے۔

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں

اور حالی یہ بھی جانتے تھے کہ :—

تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ — شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہو برادر یا پسر
الفت تمھاری کر گئی گھر دل میں جن جن کے لیے — وہ بدگمان تم سے رہے اپنے نصیبوں عمر بھر

اور نفسیات کا یہ اصول بھی شاعر جانتا ہے کہ ایک بات سنتے سنتے انسان اس سے کتنا متاثر ہو سکتا ہے۔ عورت کی ناقص العقلی کا راگ مرد نے اتنا گایا کہ وہ خود بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھنے لگی۔

یاں تک تمھاری ہجو کے گا گئے دنیا میں گیت — تم کو بھی دنیا کی کہن کا آگیا آخر یقین
علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم — سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں
جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لیے — وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں

لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ ظلم و ناانصافی کا یہ اندھیرا چھٹ رہا ہے۔ اب زیادہ دن یہ دھاندلی نہیں چلے گی اور عورت کو اس کے حقوق مل کر رہیں گے۔

نوبت تمھاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے — انصاف نے دھندلی سی ایک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا — پر حل ہر ایک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کی سدا — پر فتح جب پائی سچائی ہی نے آخر پائی ہے

اور یہ صرف عورت کو بشارت ہی نہیں مرد کو چیلنج بھی ہے۔

لیکن شاعر کے دل کا پورا درد و سوز جس شہ کار میں سمویا ہوا ہے۔ وہ مناجات بیوہ ہے۔ بقول مولوی عبدالحق نظم نہیں " دل وجگر کے ٹکڑے ہیں"! اور یہی نہیں اس میں ہمیں حالی کی شاعری کا کمال بھی نظر آتا ہے۔ فنی خلوص، بے پایاں درد و اثر، دلکش انداز بیان میٹھی رسیلی دل نشین زبان اس کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ نظم کیا ہے گویا خس وخاشاک سے پاک نتھرے پانی کی صاف شفاف ندی ہے۔ جس میں ناکامی اور مایوسی کی لہریں ہیں۔ کٹھنائیوں کے بھنور ہیں، فراق کے خوفناک نہنگ ہیں اور درد وغم کا طوفان ہے۔

ہندوستان کی بیوہ عورت کی جو حالت اس نظم میں دکھائی گئی ہے وہ کم وبیش سارے ہندوستان میں اس وقت پائی جاتی تھی اور بڑی حد تک اب بھی موجود ہے۔ اور اس لئے بہت سی ہندوستانی زبانوں میں اس نظم کا ترجمہ ہو کر مقبول ہوا۔ اس کا طرز بیان بھی اپنی جگہ بے مثال ہے۔ شاعر سماج کے اس بدترین ظلم پر نفرین کرتا۔ بیوہ عورت کی حالت زار دکھاتا اس کے دکھوں اور غموں کو بیان کرتا تو بھی بلاشبہ وہ ایک اصلاحی اور پر اثر نظم ہوتی۔ لیکن یقیناً ذہنوں پر ایسا دیرپا اثر، دلوں میں ایسی کھٹک اور دماغ میں یہ تپک نہ پیدا کر سکتی جو ایک کم سن کنواری بیوہ کی خود اپنی زبان سے اس کی بپتا سن کر ہوتی ہے۔ اور پھر وہ اپنی بپتا سناتی بھی کسے ہے؟ سماج کے ظالم ٹھیکے داروں کو

نہیں اُسے جو بے سہاروں کا سہارا، بے آسوں کی آس، مظلوموں کی سننے والا ہے۔ جس سے ایک بدنصیب بیوہ بھی اپنے دل کا حال بے کم وکاست کہہ سکتی ہے۔۔۔

اے مرے زور اور قدرت والے حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن جان سے اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے لینے کے یہاں پڑ گئے دینے
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
بیت نہ تھی جب پایا بیتم جب ہوئی بیت گنوایا بیتم
باغ میں سیلانی جب آئے پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں جا سوئے سیلانی بن میں
دن ہیں بھیانک رات ڈراؤنی یوں گزری یہ ساری جوانی
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا

بیوہ کی حالت کی کیسی سچی تصویر ہے......

روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو کیونکہ الٰہی کاٹیے غم کو
سوچ میں میری سارا گھر ہے میرے چلن پر سب کی نظر ہے

آپ کو ہوں ہر وقت ستاتی ۔۔۔ پھٹتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی
آپ کو یاں تک میں نے ستایا ۔۔۔ پر دنیا کو صبر نہ آیا
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں ۔۔۔ بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں

اور پھر کس درد سے عورت کی بے بسی اور بدنصیبی کی شکایت کرتی ہے۔

جیو گر اپنی بانٹ میں آتا ۔۔۔ کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے ۔۔۔ کیوں ہوتے اوروں کے حوالے

اور اب اس بدنصیب کی ڈوبتی کشتی کو پار تیرے سوا اور کون لگائے؟

اے بے آسوں کے کھویا ۔۔۔ اے ڈوبے بیڑے کے کھیا
کبھیو تیری کشتی بانی ۔۔۔ آپہنچا ڈباؤ پانی
اب تیرے گی تیرائی تیری ۔۔۔ ڈوبی ناؤ دھائی تیری

اور کس درد سے شکوہ کرتی ہے ؎

اب نہ مجھے جنت کی تمنا ۔۔۔ اور نہ خطرہ کچھ دوزخ کا
آئے گی جنت راس کب اسکو ۔۔۔ جلنے میں جس کی عمر کٹی ہو
ڈر دوزخ کا پھر اسے کیا ہے ۔۔۔ جس نے رنڈاپا جھیل لیا ہے

رنڈاپے کی بھیانک زندگی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا دی جا سکتی ہے!

اور پھر اپنی مصیبتیں، یا درد دل، اپنے جذبات واحساسات کا بیان، دنیا کا اپنے سے سلوک بیان کرنے کے بعد:۔

اپنے لیے کچھ کہہ نہیں سکتی ۔۔۔ پر بے کہے بن رہ نہیں سکتی
میں ہی اکیلی نہیں ہو دکھیا ۔۔۔ ٹیکی ہے لاکھوں پہ یہی بپتا

شرما سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہیں کنواری
کوئی نہیں جو غور کرے اب — نبض پہ انگلی ہاتھ دھرے اب
بے دردوں سے پڑا ہے پالا — تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا
چوٹ نہ جن کے دل کو لگی ہو — وہ کیا جانیں دل کی لگی کو

یہ آخری شعر مرد پر وہ بھرپور طنز ہے جس کا جواب نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ نفس کے بندے جو آج بیوی مرے اور دوسرے دن ایک اور بیاہ لائیں بلکہ ایک وقت میں چار چار شادیاں رچائیں، وہ کم سن دکھیا رانڈ عورت کے احساس وجذبات کو سمجھ ہی کیسے سکتے ہیں۔

اس نظم کا اقتباس کوئی کہاں تک دے۔ پانسو شعروں کی اس نظم کا ہر ہر شعر اپنی جگہ لاجواب ہے۔ اس کا پورا زور اور اثر اس وقت محسوس کیا جا سکتا ہے جب پوری نظم پڑھی جائے۔ اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی مرد ہوتے ہوئے بھی کیونکر ایسا احساس، ایسا دردمند ایسا نازک دل کے مالک تھے جس نے کم سن بیوہ کو صرف مصیبتوں اور کٹھنائیوں کو نہیں اس کے جذبات واحساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ خود اس پہ بیتا ہو۔ حالی کی سیرت کی تین سب سے نمایاں خصوصیتیں سادگی خلوص اور درد دل اس کے ہر ہر شعر میں جاری وساری نظر آتی ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے یادگار حالی میں بھی لکھ چکی ہوں، شاعری میں حالی سے پہلے ہمیں عورت کا کوئی مقام نہیں نظر آتا (انیس کے مرثیوں کی اس بلند کردار عورت کے تصور کو چھوڑ کر جو انھوں نے انتہائی کامیابی اور خوبی سے پیش کیا ہے

لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق وہ مثالی کردار امام زادیوں کے ہیں جن میں انھوں نے ہندوستانی رنگ تو ضرور بھرے ہیں لیکن ہم انھیں ہندی عورت نہیں کہہ سکتے۔ اردو شاعری میں عورت صرف محبوب کی شکل میں نظر آتی ہے اور وہ بھی کسی اونچے کردار کی حامل نہیں۔ وفا، محبت، ایثار، خدمت جو ہندی عورت کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں، ان کا کہیں ذکر نہیں۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے عورت کا جو بلند کردار ساری دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً رہا ہے، اس کا اشارہ بھی نہ ملے گا۔ محبوب کی حیثیت سے بھی وہ شریف عورت کی جگہ گھٹیا طوائف نظر آتی ہے۔ ہمارے اس دور کے ادب کا کوئی انجان پردیسی مطالعہ کرے تو اسے عورت کے روپ میں ایک بدزبان بدمزاج بددماغ بے وفا بدباطن دروغ گو آوارہ مزاج کوئی چیز نظر آئے گی جس میں مردانہ اور زنانہ صفات اس طرح سموئی ہوئی ہیں کہ دراصل اسے عورت کی جگہ ہیجڑا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور اسی بے مثال مخلوق پر ہمارا شاعر دل و جان قربان کرتا اور اس کی خاطر ہر دکھ اور مصیبت سہتے نظر آئے گا۔

حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس ہمالہ جیسی عظیم غلطی کی تلافی کی اور اردو شاعری میں ہندوستانی عورت کو اس شان سے جلوہ گر کیا کہ ساری پچھلی ناانصافیوں کا مداوا کر دیا۔ عورت کے اخلاق اور صفات کی تعریف میں ان کا جوش، شدت اور کسی حد تک مبالغہ ردعمل ہے عورت کی اس تذلیل کا، اس مسخ شدہ تصویر پیش کرنے کے جرم کا، جو ان کے پیش رو کرتے آئے تھے۔

ہندی عورت حالی کے احسان سے کبھی سر نہ اٹھا سکے گی۔ اس لیے کہ وہ

تنہا ایسا شاعر، ادیب، مصلح، نقاد اور رہبر ہے جس نے اس وقت اس پست حال بدنصیب پامال ہستی کی طرف توجہ کی۔ ایک طرف اسے شاعری میں سب سے اونچے سنگھاسن پر جگہ دی۔ دوسری طرف اس کے حقوق کا پالن کیا اس کی اصلاح کا کام انجام دیا اور اسے دنیا میں عزت شرافت اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا گر سکھایا۔

کاش آج کے مرد عورت کی ایسی ہی سچی عزت و قدر کرنا سیکھیں جیسی حالی کرتے تھے اور خلوص سے اس کے حقوق کا پالن کریں۔ ورنہ محض زبان سے آزادی اور مساوات کے راگ الاپنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور کاش ہم عورتیں آج اپنی سیرت اور اخلاق ایسا بلند بنا سکیں کہ اصلی معنوں میں حالی کی کی ہوئی تعریف پر پوری اتریں۔

مصباح علی ایم اے

تلمیحات اور حالی

اس میں شک نہیں کہ مولانا حالی جدید اردو ادب کی ایک نمایاں شخصیت کہے جانے کے مستحق ہیں اور جو خدمت مولانا نے اپنی نظم ونثر سے کی اور اس میں جو وسعت پیدا کی ہے اس کا ثبوت خود ان کے ادبی کارنامے ہیں جو ادبی نکات کے گراں بہا سرمایہ سے مالا مال ہیں۔ [illegible] نظم۔ مرثیہ۔ مسدس۔ ترکیب بند۔ قطعہ۔ تہنیت۔ شکوہ۔ مناجات۔ تاریخ غرض تمام اصناف سخن کے جواہر پارے موجود ہیں۔ ان [illegible] بالخصوص تلمیح سے [illegible] جگہ جگہ [illegible] شعر کے معنی و مطالب کی دنیا اور بھی حسین اور پر رونق ہو جاتی ہے۔

تلمیح [illegible] کا لفظ ہے۔ تلمیح کی اور [illegible] مصادر [illegible] کے معنی ہوتے ہیں گوشہ چشم سے دیکھنا یا اشارہ کرنا

گر علم ادب کی اصطلاح میں ایک صنعت ہے کہ کلام میں کسی قصۂ مشہور یا آیت یا حدیث یا کسی مضمون یا کسی مذہبی یا سماجی رسم کی طرف اشارہ کرے۔

تلمیحات سے کلام کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ لطافت اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ طویل مطالب چند الفاظ یا اشاروں میں ادا ہو جاتے ہیں۔ گویا تلمیحات کے استعمال سے دریا کوزے میں سما جاتا ہے۔

تلمیح کی اس افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے اس سے بڑھکر تلمیح ترقی کی راہ میں مشعل تاریخ بنی ہے اگر کسی ادب کی تلمیحات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کے مذہبی عقائد۔ رسوم اور ان کے معاشرتی حالات کیا تھے۔ اس طرح سے زبان اپنے بولنے والوں کے گذشتہ واقعات اور تواریخ پر روشنی ڈالتی ہے کسی قوم نے جو تمدنی منزلیں رفتہ رفتہ طے کی ہیں اور جن تبدیلیوں نے ان پر گہرے نقوش ڈالے ہیں، اس زبان کی تلمیحات کے مطالعہ سے سب نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ ادب کے اسلاف میں کون کون نامور اشخاص ہوئے ہیں وہ کن کن حالات و اوصاف سے معروف تھے ان کے مذہبی خیالات نے کیا کیا کروٹیں لیں۔ یہ سب کچھ اس فرہنگ میں ملجاوے گا جس میں اس زبان کی تلمیحات درج کیگئی ہیں

مسدس حالی اس حقیقت کا آئینہ ہے۔ ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کو انتشار نے گھیرا۔ علی الخصوص مسلمان قوم اس پولیٹیکل مشکلات کے شکنجہ میں جکڑ گئی۔ حاکم وقت اس سے بدظن تھے۔ دوسری قومیں ترقی کی راہ میں بازی لے گئی تھیں۔ مسلمان بے خبر خواب خرگوش میں مست تھا۔ سرسید نے چونکایا۔ مگر نیند کے ماتے کہاں جاگنے والے تھے حالی نے بڑھ کر ہمنوائی کی اور ان کے نقیب بنے۔ قوم کو بیدار کیا۔ ان کی آواز گویا بانگِ درا تھی جس نے سوتے ہوئے قافلے کو چونکا دیا۔ حالی کا لازوال کارنامہ مسدس مدوجزر اسلام ہے جو مسلمانوں کے شاندار ماضی کا آئینہ ہے۔ کہ ہم کیا تھے اور آج کیا ہو گئے ہیں ؎

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا — کہ اس گھر سے ابلے گا چشمہ ہدیٰ کا

وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

اس بند میں عرب کی اس دور کی تاریکی اور بت پرستی کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ جب حق کا کوئی نام لینے والا نہ تھا بلکہ چاروں طرف بت پرستی کا بازار گرم تھا۔ گھر سب سے پہلا خدا کا۔ خلیل معمار۔ چشمہ ہدیٰ اور تیرتھ میں تلمیحات ہیں جن کے پس پشت خاص مطالب نہاں ہیں۔ ان تلمیحات کے بعد ذہن مہ حرف شعر کی معنویت کا قائل ہوتا ہے

بلکہ اختصار اور ایجاز کا ایک نمونہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔

خلیل۔ حضرت ابراہیم ایک پیغمبر تھے۔ جن کا لقب خلیل اللہ تھا آپ سے پہلے بت پرستی رائج تھی۔ نمرود کو خدا مانتے تھے۔ اور اس کی پرستش ہوتی تھی۔ نمرود کی خدائی کے سحر کو آپ نے توڑا۔ عرب کے شہر مکہ میں خانہ کعبہ کی بنا ڈالی اس بناء پر آپ کو خلیل معمار کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔ چشمہ ہدٰی۔ ہدایت کا سرچشمہ مراد سرزمین عرب۔ ایک روز حضرت ابراہیم نے تمام بت توڑ ڈالے اور ایک بڑے بت کی گردن میں وہ ہتھوڑا لٹکا دیئے جس سے بت توڑے تھے حضرت ابراہیم کے باپ آذر نے پوچھا کہ یہ بت کس نے توڑے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اس بڑے بت سے پوچھو یہ سنکر سب شرما گئے اور کہنے لگے کہ بت کہیں بولتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ پھر ایسے خدا کو کیوں مانتے ہو۔ ابراہیم کی اس بات سے سب لاجواب ہو گئے اور اس ہدایت کی بنا پر ان کے جانی دشمن ہو گئے۔ گھر سب سے پہلا خدا کا مراد خانہ کعبہ ہے جو بنائے حضرت سلیمان یعنی بیت المقدس سے ۹۹۵ برس پہلے اور حساب مسیح کی ولادت سے دو ہزار برس پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

یہ بند جس قدر صفائی اور سادگی سے مملو ہے اسی قدر اس میں
زور و اثر کا ایک دریا موجزن ہے۔ تلمیح کے پردہ میں جادو بیانی کا
ایک ستارہ جگمگا اٹھا ہے۔ اس نے اپنی روشنی سے سب کو چکا چوند
کر دیا ہے اسی بنا پر امریکہ کا ایک مشہور انشا پرداز آس بورن
لکھتا ہے۔" وہ تلمیحات کیا ہیں۔ ہماری قوم کے قدموں کے نشان ہیں
جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات مزعومات اوہام
رسم و رواج اور واقعات و حالات کے سراغ لگاتے ہیں"

اس ماخذ کے پیش نظر اگر ہم اس بند پر نظر دوڑائیں۔ تو ہمارے
پیغمبر محمد صلعم کے کردار، سیرت اور عمل کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں
میں پھرنے لگتی ہے۔ آپ ایک مرد کامل تھے۔ قرآن مجید میں "وما ارسلناک
ال رحمۃ اللعالمین" آپ ہی کے لئے کہا گیا ہے یعنی محمدؐ صاحب کو
رحمت عالم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنا آپ کا شیوہ
تھا۔ غریبوں کی مصیبت میں ہاتھ بٹانا آپ کی عادت تھی۔ دوسروں
کی فکر کرنا آپ کی فطرت تھی۔ فقیروں کے آپ سہارا تھے اور
یتیموں کے سر پر دست شفقت پھیرنا آپ کا ایمان تھا۔ آپ
اپنی سیرت و کردار سے نمونہ اعلیٰ اخلاق تھے۔ سوانح حیات
کے پچھلے ورق دھرائیے تو بیشتر واقعات اور حالات ملیں گے
جن میں آپ نے اپنی جان کا خطرہ مول لے کر خدمت خلق کے فرض
کو انجام دیا ہے اور دوست دشمن سے یکساں ہمدردی فرمائی ہے۔

اسی بنا پر آپ کو رحمت عالم کی تلمیح سے یاد کیا گیا ہے۔ اور سب نبیوں پر افضلیت محض رحمت لقب پانے پر ملی ہے۔

نہ ہنگامہ گرم تھا عبرانیوں کا — نہ اقبال یاور تھا نصرانیوں کا
پراگندہ : فتر تھا یونانیوں کا — پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا

عبرانیوں سے مراد یہودی ہیں۔ جو سود کا کاروبار کیا کرتے تھے روپے کی لین دین کی وجہ سے ان کا بازار گرم رہتا تھا۔ نصرانیوں سے مراد عیسائی ہیں جن کے اقبال کا چرچا دور دراز کے ممالک میں تھا۔ یونان ایک قدیم ملک ہے وہاں کے ہفت دانا مشہور ہیں اس لفظ سے عقل اور دانائی کی تلمیح مراد ہوتی ہے۔ ساسانیوں۔ ساسان اردشیر بابک کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ہیں وہ ساسانی کہلاتے ہیں۔ روما۔ روما اٹلی کا بڑا مشہور شہر ہے جو کہ دریائے ٹائبر کے بائیں کنارے بحرہ روم شام سے سولہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ رومیوں کی شہنشاہی کے عہد میں یہی شہر دارالسلطنت تھا۔ ایران قدیم شہر ہے جو علم و تہذیب کے لئے ضرب المثل ہے۔

زمانہ وسطیٰ جو کہ حضرت عیسیٰؑ سے لیکر ۱۵۰۰ء مسیحی تک۔ یا تقریباً آٹھ سو برس تک تمام یورپ میں تاریکی اور اندھیرا چھایا رہا ظلم اور بدنظمی اور جہل اور ضلالت اور بددیانتی تمام قوموں پر غالب تھی

یہی حال ایشیا اور افریقہ میں تھا۔ عبرانیوں کے سکہ کا بازار سرد تھا۔ نصرانی بادشاہوں کا اقبال لینی میں تھا۔ یونانیوں کی عقل دنگ تھی اور کام نہ کرتی تھی۔ ساسانی بادشاہوں کا نظام درہم برہم تھا۔ روم اور ایران جو علم اور تہذیب کے سرچشمے سمجھے جاتے تھے وہ بھی تاریکی کے پردوں میں گھرے تھے اس وقت اسلام کی بدولت صرف عرب نے پرانی دنیا کے ہر حصہ میں علم مذاہب کی روشنی پھیلائی تھی۔ تلمیح کی وضاحت کے بعد اس شعر کی ادبی شان اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے

تعصب نے بہتر لوح ... | بھرے گھر کیے سیکڑوں جس نے ویران
ہوئی بزم نمرود جس سے پریشاں | کیا جس نے فرعون کو نذر طوفاں

گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

تعصب اصل میں بے جا حمایت یا طرفداری کو کہتے ہیں مگر چونکہ اکثر بے جا حمایت کے ساتھ ہی بے جا مخالفت اور بے جا نفرت بھی پائی جاتی ہے اس سے تعصب کا اطلاق حسد و افسوس پر ہوتا ہے جیسا کہ اس بند میں مولانا حالی نے تلمیحات کے اشاروں سے اس امر کی وضاحت کی ہے

نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں ایک نہایت متکبر بادشاہ عرب میں گذرا ہے جس کی بادشاہت ہفت اقلیم میں تھی۔ نمرود کو نجومیوں نے بتلایا کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری ہلاکت کا باعث ہوگا

نمرود نے انتظام کیا کہ کوئی لڑکا نہ پیدا ہونے پائے مگر باوجود اس انتظام کے حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی۔ نمرود حضرت ابراہیم کے درپے آزار ہوا۔ اور آپ کا کام تمام کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ آخر میں اسی تعصب کی بناء پر نمرود کی ہلاکت ایک مچھر سے ہوئی جو اس کی ناک میں گھس گیا تھا۔

فرعون۔ مصر کا بادشاہ تھا اس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ کسی منجم نے فرعون سے پیشین گوئی کی تھی کہ حضرت عمران پدر موسیٰ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیرا کام تمام کرے گا۔ فرعون ان کی اولاد کو ضایع کرنے کی فکر میں تھا۔ والدہ حضرت موسیٰ نے ان کی ولادت پر ان کو ایک صندوق میں رکھکر دریائے نیل میں بہا دیا۔ اتفاق سے وہ صندوق فرعون کی بیوی کے ہاتھ لگا۔ حضرت موسیٰ فرعون کے گھر میں پلے اور جوان ہوئے ایک مرتبہ فرعون کو شبہ ہوا کہ یہ بچہ وہی ہے جو میرا قاتل ہوگا۔ چاہا قتل کرڈالے مگر فرعون کی بیوی حائل ہوئی فرعون نے اس بچے کا امتحان عجیب طریقے سے لیا۔ ایک طشت لعلوں سے اور ایک طشت انگاروں سے بھرا سامنے لایا گیا۔ فرعون کا خیال تھا کہ اگر یہ بچہ وہی ہے جو میرا قاتل ہوگا تو انگاروں پر ہاتھ نہ ڈالے گا جب بچہ نے ہاتھ لپکایا تو قریب تھا کہ لعلوں کے طشت پر پڑے مگر فرشتہ نے ہاتھ کھینچکر انگاروں کے طشت پر رکھدیا اور ایک انگارہ اٹھایا اور جھپ سے منہ میں رکھ لیا۔ ایک مرتبہ ایک قبطی

اسرائیلی نسل کے آدمی کو مار رہا تھا۔ حضرت موسیٰ سے جو خود اسرائیلی نسل سے تھے نہ دیکھا گیا قبطی کو مار ڈالا۔ اب کیا تھا فرعون کو پورا علم ہو گیا کہ میرا قاتل یہی بچہ ہے چنانچہ ہر طریقے سے حضرت موسیٰ کے درپے آزار ہوا اور ان کی جان کا خواہاں ہوا۔ اسی تعصب اور بے جا مخالفت میں فرعون کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

حقیقت میں تعصب ہی نوع انسان کا دشمن رہی ہے۔ تعصب کی بنا پر نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت سے، فرعون حضرت موسیٰ کی عناد سے اور ابولہب اور ابوجہل ہمارے نبی کی دشمنی سے ایسے برباد ہوئے کہ ان کی تباہی آج تک ضرب المثل ہے۔

نبی نے کہا تھا جنھیں فخرِ امت — جنھیں حملہ کی مل چکی تھی بشارت
مسلّم ہے عالم میں جن کی عدالت — رہا مفتخر جن سے تختِ خلافت

وہ پھرتے تھے راتوں کو پھر پھر کے در در
کہ مضطر نہیں اپنا کہیں بے بس گھر

اس بند میں اس واقعہ کی طرف پوری تلمیح کی گئی ہے جو حضرت عمرؓ کے عہد میں پیش آیا۔

ایک بار کچھ سوداگر شہر سے باہر اترے رات کو آپؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف حسبِ عادت گشت کرنے کے لئے وہاں گئے۔ ان کو رات بھر میں تین بار ایک بچہ کی رونے کی آواز سنائی دی۔ آپ ہر دفعہ اس خیمہ کے پاس جاتے اور اس کی ... آتے تھے کہ تو کیسی

بڑی ماں ہے۔ کہ تیرا بچہ اوّل شب سے بے چین ہے آخر اس عورت نے کہا کہ اے خدا کے بندے تو نے مجھے ساری رات دق کیا۔ میں اس سے دودھ پینے کی عادت چھڑاتی ہوں اور وہ ضد کرتا ہے کہا کیوں؟ کہا عمرؓ بے دودھ چھٹے بچوں کا وظیفہ مقرر نہیں کرتا۔ یہ سنکر آپ بہت روئے اور کہا کہ خدا جانے مسلمانوں کے کتنے بچے میرے سبب سے ہلاک ہو گئے ہوں گے اسی وقت منادی کرائی کہ کوئی عورت اپنے بچہ کا دودھ جلدی نہ چھڑائے اور تمام ملک میں حکم دیا کہ ہر مسلمان کے یہاں بچہ ہوتے ہی اس کا وظیفہ مقرر کیا جاوے۔

تلمیح کے پیرائے میں اتنے بڑے واقعہ کو چند لفظوں میں" وہ پھرتے تھے راتوں کو حبیب حبیپ کے در در" کے ہیر پھیر میں کتنی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ ادائے مطالب کے ساتھ انداز بیان کس قدر جاذب اور دلکش ہے۔ مولانا حالی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ محاسن کلام کو محض زیب و آرائش کے لئے نہیں لاتے بلکہ ان کا استعمال جس مقام پر کرتے ہیں اس سے اس شعر کی واقفیت میں اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

تلمیح کے بہت اقسام ہیں۔ یہاں ان سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ منجملہ ان کے ایک ذہنی تلمیح ہے۔ نثر یا نظم میں کوئی اشارہ یا حوالہ ایسا ہو جس کے مطالعہ سے ذہن اس حادثہ یا واقعہ یا قصہ کی طرف یک لخت منتقل ہو جاوے اس کی ہو بہو تصویر یا اس کا نقشہ آنکھوں

میں کھینچ جاوے۔ مثلاً اگر کسی مقام پر "انقلاب فرانس" کا یا غدر ۱۸۵۷ء کا ذکر آجاوے تو ناظریں کا ذہن ان ہولناک مناظر کشت و خون غارت گری اور انتشار کی طرف منتقل ہوجاوے کہ جس کے محض تصور سے۔ رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں

"جشن جوبلی" حالی کی ایک معیاری نظم ہے اس نظم میں مولانا ایک مقام پر عرب کے اس دور جہالت اور تاریکی کی ذہنی تصویر محض دو لفظوں کی تلمیح سے پیش کرتے ہیں جس سے عرب کے اس زمانہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے کہ جب عرب کے غیور لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے تاکہ ان کو اپنی لڑکیوں کے لئے کسی سے کوئی رشتہ نہ تلاش کرنا پڑے اور ان کی آن بان میں دھکہ نہ لگے اور دیگر قبیلوں کی نگاہ سے گر نہ جاویں۔ آج ہم آپ اس زمانہ کو سوائے ننگ انسانیت کے اور کسی دوسرے نام سے نہیں یاد کر سکتے۔ تلمیح کی گلکاری ایک طرف اور واقعہ کی سحر طرازی ایک طرف۔ دونوں کو یکجا کس خوبی سے سمویا ہے

بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب
جو لوگ روا رکھتے تھے خونریزیٔ دختر

دور نہ جائیے۔ ہندوستان کی تاریخ کے چند پچھلے اوراق دوہرائیے۔ ایک معاشرتی دور ایسا بھی ملتا ہے جب زندہ عورتیں اپنے شوہر کے ساتھ چتا میں بیٹھ کر ہنسی خوشی جل جایا کرتی تھیں۔

نہ جانے کتنی لاتعداد عورتیں اس بھیانک رسم کے بھینٹ چڑھ گئی ہوں گی۔ اس اسم کو رسم ستی کہتے ہیں۔ اس طرح کے حوالے جات تواریخی تلمیحات کے ضمن میں آتے ہیں۔

دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کو
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہد کہن پر

حالی نے ہند کے اس تاریخی دور کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب یہ انسانیت سوز رسم رائج تھی۔

نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ ، نہ کچھ شیریں کو درد کوہکن
دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ بیت حزن کس کا ہے
ایک کہانی پیرزن کی رہ گئی ، راج کسریٰ کا نہ باقی نہ پاٹ

متذکرہ بالا اشعار میں جن تلمیحات کا ذکر آیا ہے وہ مولانا حالی کی خودساختہ نہیں ہیں بلکہ قدما کی طرح حالی نے بھی اس کی دوسروں سے خوشہ چینی کی ہے جو ہمارے ادب میں دور دراز ممالک مثلاً ایران۔ عرب۔ عجم۔ توران۔ شام۔ مصر یونان روم وغیرہ سے سفر کر کے داخل ہو گئی ہیں۔ اور اب ان کی اہمیت اس قدر اعلیٰ وارفع ہو گئی ہے کہ وہ ہمارے ادب کا ایک اہم جزو بن گئی ہیں جن کو اگر ہم علیحدہ کرنا چاہیں تو بھی ممکن نہیں بلکہ امر محال ہے۔

واردات عشق کی خوبصورت سے خوبصورت تصویر دصد ھلی ہو

حسن میں لیلیٰ و مجنوں کی محبت کی رنگ آمیزی نہ کی جائے حسین سے حسین شے پھیکی اور ماند ہے اگر اس میں حسن یوسف کا پرتو نہیں پڑتا عشق کی وہ رنگین ہیچ اور صدا بصحرا ہے حسن میں فرہاد ایسا کوہکن شیریں کے عشق میں ضرب تیشہ سے ہلاک ہو جاتے۔ انصاف و فریاد کی وہ صدا [illegible] سرو نے حسن میں رواداری کی خاطر بڑھیا کے جھونپڑے کا ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر نہ کیا ورنہ خواہ طاق کسریٰ کج ہو کر بے محل اور بے رونق ہو جاتے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ تلمیحات خواہ کہیں سے بھی منزل طے کر کے آئی ہوں، ہمارے ادب میں اب ان کا ایک خاص مقام اور مقصد ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تلمیحات کلام میں زور، وسعت، دلآویزی اور اثر پیدا کرنے کی ایک اہم کڑی بن گئی ہیں۔

بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی و مطالب ادا کیے جائیں۔ یہ بات جس قدر تلمیحات میں پائی جاتی ہیں الفاظ کی دیگر [illegible] نہیں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کی اہم کڑی [illegible] محسوس ہوتی ہے [illegible] کسی سحر کا [illegible] ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ وہ ایک [illegible] ہوتی مگر اس کی یہ دلآویزی دلکشی اور ہر دلعزیزی نہ ہوتی جو کہ معنویت کی آج وہ مالک بن چکی ہے۔

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

انتخاب دیوان حالی

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
پھوٹے ہوئے ہیں گو جا بجا دل سدا سے تیرے ہیں
ملنے سے کبھی سوا ہے تیشنا محال تیرا
گو بحکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

رخ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل ہیں واں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا
لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریا پہ چڑھ کے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ آر دیکھا نہ پار دیکھا
خبر نہیں ہے کہ کیا ہے کیسا ہے کون ہے اور تو کہاں ہے
یہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا

پردہ ہوا کہ کینۂ شمر و یزید کا — چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

ہے نزد ہاں جذبۂ توفیق درمیاں — یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا

ہے آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ
خون جگر میں نشہ ہے جام نبید کا

دنیا کے خرخشوں سے نپٹ اُٹھتے تھے ہم اوّل
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم — ایسی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری — احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا

اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا — گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی — بس اب اپنے شکوؤں کو دھونا پڑے گا
بن آئیگی ہرگز نہ یاں کچھ کئے بن — جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا
ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی — مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے انس — ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھکو خبر ناصح — کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب — مجھکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شب تنہائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم — شوق تھا بادیہ پیمائی کا
سات پردوں میں ٹھہری نہیں آنکھ — حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جبتک — ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل　　مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا
بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا　　پوچھنا کیا تری زیبائی کا
مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں
ہو چکا کام توانائی کا

دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال　　ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا
روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا　　کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا　　دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور　　مرا شکر اس کا گلا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا　　وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد　　ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

سنگ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا — اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا
[illegible]ِ خوشی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
[illegible]مشا بھی دو خلشِ آرزو سے قتل — کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو — ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب — کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر — ظلِ بالِ ہما سے کیا مطلب
جن کے معبود حور و غلماں ہیں — ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب
صوفیِ شہر باصفا ہے اگر — ہو ہماری بلا سے کیا مطلب
نکہتِ مے پہ عشق ہیں جو حالیؔ
اُن کو دُرد و صفا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تاب و ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
جس دل کو قیدِ ہستیٔ دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب
حالیؔ تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

کو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلےٰ کر دیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت
کر دیا چپ واقعات دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
ہے غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل — ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں — دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج — بول کر ہم نے منہ کی کھائی آج
چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ — بات بگڑی بنی بنائی آج
کل یہاں کاروبار ہیں سب بند — کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

کاٹیے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

ذکر حق کے لئے کچھ سوز نہاں بھی ہے ضرور
خشک نعروں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر   وہی اصرار ہے خطاؤں پر
ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا   مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ   ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ
دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے   سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ
عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ   دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اجاڑ

عہد وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز   عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں   ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

رنجش و التفات و ناز و نیاز   ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اُس میں پاتا ہوں   دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

خاک میں ہم نے لا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس

اک ہم کو مہم بسر ایام ہے درپیش   بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش
غفلت سے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے   اور معرکۂ گردشِ ایام ہے درپیش
گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت   پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش

[redacted]

وہ وقت گیا نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا — اب وقت خمارِ مئے گلفام ہے درپیش

ہر بشر سے اُس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص
دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دُنیا سے مگر
رہزنِ دل ہیں ابھی اس کی ادائیں خاص خاص
گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص
زہد و تقوے سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص
یوں تو ہے اُمید سب کچھ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص

قافلے گذریں وہاں کیونکر سلامت واعظ — ہو جہاں راہزن اور راہ نما ایک ہی شخص

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض — چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
دل میں ہے اے خضر گر صدقِ طلب — راہ رو کو رہنموں سے کیا غرض
آئے ہو حالی پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

چاہیئے ایک سب کا ہو مقصود   گو ہوں سب کے جُدا جُدا اغراض
دیکھئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش   اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض
رائے ہے کچھ علیل سی تیری   نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض
وعظ میں گُل کترتے ہیں واعظ   منہ میں ان کی زباں ہے یا مقراض

رات گزری ہو چکا دورِ نشاط   طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں   فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط
کوچ کی حالی کرو تیاریاں   ہے قوے میں دمبدم اب انحطاط

اے بہارِ زندگانی الوداع   اے شبابِ شادمانی الوداع
اے بیاضِ صبحِ پیری السلام   اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
السلام اے قاصدِ ملکِ بقا   الوداع اے عمرِ فانی الوداع
فرصتِ عشق و جوانی الفراق   دورِ عیش و کامرانی الوداع
تجھ کو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں   اے نعیمِ جاودانی الوداع
آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں   باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لائق — نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لائق
مکاں عاریتی اور لباس بوسیدہ — بہت ہے زندگیٔ مستعار کے لائق
کرے گی یاد بہار آکے اب کسے سرسبز — رہا نہ باغ قدومِ بہار کے لائق
گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالیؔ — تھمیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

دلوں کا کھوٹ اگر کہیئے برملا ایک ایک — تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک
سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں — جہاں ہے راہزنِ خلق رہنما ایک ایک
رہا ہوں رند بھی لے تسبیح پارسا بھی میں — مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک
ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو — ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
وہ عشق ہے نہ جوانی نہ وہ تو ہے نہ وہ ہم — پہ دل پہ نقش ہے اب تک تری ادا ایک ایک
ہوا نہ ایک بھی حق اس کی بندگی کا ہوا — کیا ہے جس نے حقِ بندگی ادا ایک ایک

عالم آزادگاہ ہے اک جہاں سب سے الگ — ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ — رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں — ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ
جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں — رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ
سینکڑوں پھندوں میں یاں جکڑے ہوئے ہیں بند بند — پر ٹٹولے کوئی دل ان کا تو ہے واں سب سے الگ
شاعروں کے سب میں انداز سخن دیکھے ہوئے — دردمندوں کا ہے ڈھرا اور بیاں سب سے الگ
سال ہے نیا، سب یگانہ ہیں اک ستر بے خبر — شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ — کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
علم گیا اخلاق گیا ہتھیا کیا — سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ — یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا — دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی امنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کہیں — دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ
قوم کو حالیؔ نہیں راس اتفاق — پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہے یہ رنگ

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل — یا زمانہ ہی گیا یارب بدل
کب تلک آخر ٹھہر سکتا ہے وہ نخل — آ گیا بنیاد میں جس کی خلل
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی — لا چکے پودے بہت نگلوں کے پھل
دیکھئے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع — ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل
کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں — وقت کوشش کا گیا شاید نکل

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

دلکش ہر ایک قطعہ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
بنتے ہیں عیش ایسے ہوتے ہیں رام جستی — الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
روتے ہیں جا بہم پر ہنستے ہیں جا بجا ہم پر — یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
فصل و ہنر بزرگوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

سُر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں
غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

رازِ دل کی سیر بار ار خبر کرتے ہیں — آج ہم شہر میں خون اپنا بدر کرتے ہیں
جی رکاوٹ سے جو اُن کی کبھی رک جاتا ہے — اک لگاوٹ ہیں ادھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں
اکسو یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب — یا اسی طرح سے سب غم بسر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں

ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشم انسان و چشم نرگس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

آج کل چرخ صلح جو ہے بہت
دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں

پھر زخم پھوٹ نکلا، حالی نہ چھیڑنا تھا
فصل خزاں کا قصہ ذکر گل و سمن میں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

ہیں دور جام اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات پھر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

یونہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی　　عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

یہ بستی ... عمِ ہجراں ... نہیں　　چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں
مجھ سے ... دل یوں ہی ... جائے گا　　بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں
... کو ... محبوب　　خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں
... کے ساتھ　　اب وہ کل سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

ہم نے ... مقصود کا پایا ... سے　　جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

... ذوقِ دید بھی　　جائیگا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
... صبا کھاتے ہیں　　مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں
... دل ... حرف آشنا　　لے جائے ہم کو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں
... نہیں مگر　　وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ... سے آشنا　　اب ہم کہاں ہو ملے نشاطِ وطن کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح　　لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی ... بوالہوس بھی ...　　دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
... جب نام ... کا　　بہت وسعت ہے میری داستاں میں

تقاضائے محبت ... مگر نہ　　مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو
مجھے ڈالا ہے ... گماں میں　　بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

دل ... تجھے ... یہ دل　　دوا ... نہیں چاہو

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ — فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد — [illegible] ہاتھ لیتے ہیں نیت سے سب کچھ
دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا — ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ
یہ ہے میر مجلس کہ جینے کی صورت — ٹٹولو تو ہیچ اور دیکھو تو سب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم — یہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں — یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ — مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سن — مری الفت در و دیوار سے پوچھ
دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری — کمندِ گیسوئے خم دار سے پوچھ
دلِ مہجور سے سن لذتِ وصل — نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست — کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ
فریبِ وعدۂ دیدار کی قدر — شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم — وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

گر رستے دوا سے تو جو ہو سے یہ دعا کے — در گزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے
سائلِ دلِ انساں میں ہے کم دولتِ کونین — شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان اٹھا کے
حسرت پڑے دیجئے دستک درِ دل پہ — جھکئے فقرا سے نہ جھکئے امرا سے

کب تک قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

۱۰ غلط اک عیب ہے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا　　ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے　　ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے
عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز　　کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
سیاہ و سپید سپاہ باغ باغ ہیں لیکن　　بھیڑ روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے
ہمت سے کھو دیے تھلجان بے نوائی نے　　ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے
خوف مرنے سے جب تھا نہ اب کچھ حالی　　کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بری اور بھلی سب گزر جائے گی　　یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتا　　ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا　　کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں　　یونہیں عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا　　یہی ایک دن کام کر جائے گی

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی　　بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی
جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے　　گھات میں انکے لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی
اے غم دوست تجھی پر نہیں اپنی گزراں　　کچھ فتوح اسکے سوا اور ہے بالائی بھی
عقل اور حسن پہ جن کے کھری مجلس ہو گواہ　　انکو خود رائی بھی پھبتی ہے خود آرائی بھی
ملنے دیگی نہ اجل تم سے کہیں جی بھر کر　　فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی　　بنائی بہت بات پر بن نہ آئی
بڑائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن　　کہاں یہ بڑائی کہاں وہ بڑائی
رکا ہاتھ جب پارسا بن گئے تم　　نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

جو کہئے تو جھوٹی جو سینے تو سچی — خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی
ہوئی آ کے پیری میں قدر جوانی — سمجھ ہم کو آئی یہ ناوقت آئی
وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت — وہی کر دکھاتا ہے پربت کو رائی

وصل کا اب بھی دل زار تمنائی ہے — نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو ڈر اپنا ہے — ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے
نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی — بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے — جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
دیکھ لے بلبل ذرا گلچیں کو آنکھیں کھول کر — پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق — آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ — جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

وقت تھا جو کام کا حالی گنوا بیٹھے اسے — جائیے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجئے

جانتا ہے وہی دل پہ ہے گزری جس کے — ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیا کیا

سعی سے بہتر تن آسانی مری — کفر سے بدتر مسلمانی مری
ہے لباس جسم تک مجھ پر گراں — دور جا پہنچی ہے عریانی مری
قدر نعمت ہے بقدر انتظار — حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سنا گئے اور مہرباں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید — اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
غالب کے ساتھ کوئی ہمارا دکھڑا ملا — کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

تم جو ناحق ہمیں ستانے لگے — آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
ہم نہ سمجھے کہ اس وقت میں — وہ ہمیں بہت آزمانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

حسرت ہے دل کو دیکھا چاہیے — کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے
ہے تجلی بھی نقاب روئے یار — اس کو ان آنکھوں سے دیکھا چاہیے
ہے فقط اک باقی نقش امید کی — یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے
دوستوں کو بھی ہو ویرانہ جیسے — بے نیازی اس کی دیکھا چاہیے
جانے کوئی نہ یہ سب راز و ادا — بے اعتنائی جتنا چاہیے

حسن کو دشمن ہو جانا چاہتا ہے — قدم دست پیدا ہوا چاہتا ہے
ہوا آنے لگے سود آمیزاں کے — مارے ان سے گویا ہوا چاہتا ہے
رقیب کام لینے لگے جب ان سے ہم کو — وہ صرف تمنا ہوا چاہتا ہے
مجھے کل سے وعدے پہ کرتے ہیں حجت — کوئی وعدہ ورا ہوا چاہتا ہے
فلق گر نہیں ہے دراز ہستانی — کوئی دل میں رسوا ہوا چاہتا ہے
وہ داشمنا الفت کی نہیں کہاں تک — دل ابھی کا تجھ سا ہوا چاہتا ہے
تم شاد کرتے مجھے تیرے ہمدم — سو وہ کس گوارا ہوا چاہتا ہے
محبت میں سے دن گزرتے ہیں حالی — کوئی منہ رہا ہوا چاہتا ہے

جس کو حصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے　　آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجئے　　اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے
شیخ یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے　　توبہ انکی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے　　آخر کو ہم حوالہ تقدیر کر چکے
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے　　ہم شکوہ ہائے خیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے ہے تصور مژگاں میں چند روز　　دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے

نہ واں پرسش نہ یاں تاب سخن ہے　　محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی　　وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات　　مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے
عدو سے بات محفل میں نہ کرنی　　جو سچ پوچھو تو جائے سوء ظن ہے
بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار　　تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور　　تصور میں ترے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم　　خموشی میں مری ذوق سخن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول　　جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس عصر کی بو　　جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام　　یہی گر جذبۂ مہر وطن ہے

معلوم تھی ایسی پارسائی کی　　کی بھی اور کسی سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت　　ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے　　تم کو عادت ہے خود نمائی کی

جنگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں — صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
دل رہا پائے بند الفت دام — تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے — رکھئے اُمید دلربائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی
موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے — ساعت آپہنچی اُس جدائی کی

کر دیا خوگرِ جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے
صبر کا ہے بہت بُرا انجام — ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے
رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے
دور ہو اے دل مآل اندیش — کھو دیا عمر کا مزا تو نے
ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ — کیا کیا چشم آشنا تو نے
خوش ہے امید خلد پر حالی — کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

دل کو درد آشنا کیا تو نے — درد دل کو دوا کیا تو نے
طبع انساں کو دی سرشتِ وفا — خاک کو کیمیا کیا تو نے
تھی جہاں کارواں کو دینی راہ — عشق کو رہنما کیا تو نے
ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی — عقل کو ناخدا کیا تو نے
پردۂ چشم تھے حجاب بہت — حسن کو خود نما کیا تو نے
حالی اٹھا ہلا کے محفل کو — آخر اپنا کہا کیا تو نے

چند ضروری مقطعے

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے — کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا — یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن — راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

تیغ میں برش یہ لے حالی نہیں — جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون — شعر تو سب ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

کیجئے کیا حالی نہ کیجئے سادگی گر اختیار — بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی — یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دلخراش بیاں — رہے گی حالی دلگیر کی صدا ایک ایک

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر — ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

دل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی — الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

متاع بے بہا ہے شعر حالی — مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں — بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

حالی نثر نگار

ڈاکٹر سید عبداللہ

حالی کی نثر نگاری

حالی کے ابتدائی نثری تصانیف کی فہرست یہ ہے (۱) تریاق مسموم مطبوعہ ۱۸۶۷ء، بجواب ہدایت المسلمین (ایک مذہبی مناظرانہ نوعیت کا رسالہ) (۲) میلاد شریف۔ تبصرہ بر تاریخ محمدی از پادری عماد الدین۔ (۳) علم طبقات الارض (۴) مجالس النساء۔

مگر ظاہر ہے کہ ان کتابوں کے مصنف حالی وہ حالی نہیں جنھیں دنیا اردو کے چند بڑے نثر نگاروں میں شمار کرتی ہے ـــــ یہ تو وہ حالی ہیں جن کے قلم سے اردو کی چند بہترین سوانح عمریاں نکلیں اور اردو کی اوّلین بااصول تنقیدی کتاب ظہور میں آئی اور اس کام کیساتھ ساتھ انھوں نے اچھے اچھے مضامین۔ (مضامین لطیف) بھی لکھے۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری ان کے وہ اصول تنقید ہیں جن کی اہمیت و حیثیت آج بھی تسلیم شدہ ہے۔

موجودہ مضمون میں ان کی سوانح نگارانہ فن کاری اور ان کی ناقدانہ فضیلت

سے بحث نہیں ہوگی۔ اس وقت تو ہمیں محض ان کی نثر نگاری کے خصائص پر نظر ڈالنی ہے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان خصائص کا سوانح نگاری اور ناقدانہ تحریروں کے موضوعات سے بھی ناگزیر تعلق ہے کیونکہ ہر موضوع تحریر و اسلوب کے جداگانہ اوصاف کا حامل ہوا کرتا ہے جن کو کسی ایسے جائزے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالی کے متعلق کہا گیا ہے کہ انشا میں وہ سرسید کے تابع اور مقلد تھے اور یہ بات ایک لحاظ سے غلط بھی نہیں مگر یہ سمجھ لینا صحیح نہ ہوگا کہ حالی اور سرسید گویا فی الاصل واحد تھے جن کی شخصیتوں کے رنگ فرق اور تباین کہ ہر رنگ سے آزاد تھے۔ یہ صحیح نہیں اور ممکن بھی نہیں۔

بات یہ درست ہے کہ حالی دبستان سرسید ہی کے ایک فرد تھے۔ اور بنیادی طور پر ان کی تحریر میں بہت سی وہ باتیں موجود ہیں جو سرسید کے مکتب سے مخصوص ہیں مثلاً سادگی، منطق، اور بحث اور بے تکلف اظہار ——! مگر اس سے یہ سمجھ لینا کہ وہ سرسید ہی کی طرح لکھتے تھے صحیح نہ ہوگا۔ ان دونوں انشا پردازوں کی انشا میں بڑا فرق پایا جاتا ہے —— اتنا ہی جتنا سرسید کی شخصیت اور حالی کی شخصیت میں تھا۔

اب اگر ان دونوں کا مختصر سا جائزہ لیا ہو تو ہم یوں کہہ سکیں گے کہ سرسید کی تحریریں سادہ ہونے کے باوجود کرخت اور ناہموار ہوتی ہیں اس کے برعکس حالی کی تحریر میں ان کی سادگی میں لطافت اور سہولت پائی جاتی ہے۔ سرسید کی منطقیت کرخت اور سخت ہے مگر حالی کی منطق شاعرانہ منطق کی طرح نرم و لطیف ہے چنانچہ حالی بالکل شاعروں کی طرح قیاس تمثیلی سے کام لے کر

بعض قضیوں کو حسن تعلیل کی صورت دیتے ہیں سرسید کی تحریر میں حسن تعلیل کی مغالطہ انگیزی بالکل نہیں ہوتی ان کے بیانات قطعی ہوتے ہیں مگر حالی کی قطعیت میں بھی شاعرانہ تیقن کا انداز عقلی تیقن کا رنگ نہیں۔ ان امتیازات سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حالی سرسید کے ہم عقیدہ ہونے پر بھی ان سے بالکل مختلف آدمی تھے ـــــ اور جس طرح ان کی شخصیت الگ عناصر ترکیبی سے وجود پذیر ہوئی تھی اسی طرح ان کی تحریر کے رنگ بھی بالکل منفرد تھے۔

حالی کے اسلوب خاص کی نمایاں خصوصیات چند در چند ہیں سب سے پہلی بات تو ان کی تحریروں میں یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو اپنی تحریروں میں بہت کم دخیل ہونے دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے جس قدر ان کی انشا غیر شخصی IMPE RSONAL ہے سرسید کے رفقا میں سے کسی اور شخص کی نہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں وہ عموماً بے تعلق مبصر، واقعہ نویس اور واقعہ نگار معلوم ہوتے ہیں ـــــ حیات جاوید میں کسی حد تک یادگار غالب میں بھی وہ چاہتے تو اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ آئینہ بندی کرتے اور سرسید کے پردے میں اپنی ہی کہانی سنا دیتے ـــــ مگر حیات جاوید کے اوراق سے زیادہ ان کی بے تعلقی کا گواہ اور کون ہوگا؟

حیات سعدی میں شخصی رابطے کی مثالیں کچھ ہیں مگر ان سے کسی کو دھوکا نہیں ہو سکتا ـــــ دونوں انشا پردازوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے ـــــ اور پھر جتنا شخصی رابطہ یا جذباتی تعلق اس کتاب کے اندر نظر آتا ہے اتنا تو ہونا ہی چاہیئے ـــــ ورنہ ہم حالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے

اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ! یہ تو کوئی مومی مجسمہ ہے جس کے پہلو میں انسان کا دل ہی نہیں۔ دنیا میں اس طرح کے مصنف نہیں ملیں گے۔ جن کو اپنے موضوع سے کوئی شخصی لگاؤ ہی نہ ہو ـــــ کوئی جذباتی تعلق ہی ـ ہو، اور حالی کے متعلق تو ہم بازعان ویقین جانتے ہیں کہ وہ ایک دردمند اور بالحاظ دل کے مالک تھے جس کی شرافتوں کا حال کسی کور ذوق بے بصیرت ہی سے پوشیدہ ہوگا ـــــ ورنہ غزل گو حالی کے دردمند دل کا حال تو سبھی جانتے ہیں۔

حیات سعدی میں شخصی تعلق کے نشانات بھی بڑی وضع داری کی شان سے نمودار ہوئے ہیں۔ سعدی سے ذاتی عقیدت، ذاتی عقیدت سے زیادہ صفاتی عقیدت معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اس کتاب میں سعدی کا کمال ابھارا گیا ہے تاکہ حالی کی عقیدت ناگزیر اور قدرتی معلوم ہو ـــــ واقعہ نگاری کے ضمن میں ذاتی تبصرے یا حاشئے بھی گاہے گاہے آجاتے ہیں مگر یہ تبصرے شبلی کے جملہ ہائے معترضہ معلوم نہیں ہوتے بس مشفقانہ انداز کے اضافے ہیں جن میں اعتراض کی یا دخل درمعقولات کی بو تک بھی نہیں پائی جاتی۔

غرض یہ کہ حالی کا فن تحریر بے تعلقی اور لحاظ و شرافت کا مکمل آئینہ ہے اس میں سادگی، منکسرالمزاجی، محبت، شفقت، خلوص، تہذیب دھیماپن اور سلامت مزاج کے جوہر صاف صاف نمایاں ہیں۔

حالی کے فن میں بے تعلقی کا ہونا اپنی جگہ ایک بہت بڑی خوبی ہے مگر اس کی وجہ سے ان کی تحریر پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں جذباتی اعتبار

سے روکھاپن پایا جاتا ہے۔ ! اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کی تحریر کو پڑھکر عام طور سے دل میں جوش کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ ایک 'جوئے نرم سیر' کی طرح ان کی تحریر کا آہنگ دل آسا ہو جائے تو ہو جائے مگر اس میں حرکت اور تیزی کا انداز کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ انکی تحریریں خشک اور بے روح ہیں جیسا کہ ضیاءالاسلام صاحب کو محسوس ہوا اور یہ خیال ظاہر کیا ہے:۔

"حالی کی تحریریں جذبے سے خالی اور بے روح اور روکھی پھیکی ہوتی ہیں"

یہ شاید اپنے اپنے پڑھنے کا فرق ہے۔! "حالی کی تحریریں جذبے سے خالی ہیں بے روح ہیں۔ روکھی پھیکی ہیں" یہ تینوں باتیں غیر مشروط طور پر تسلیم کرنا ذرا مشکل ہی ہوگا۔

اب ذرا جذبے کے مسئلے کو کریدیئے۔! یہ جذبے کی بات ذرا سی جستجو کی متقاضی ہے۔ دلیل چاہتی ہے۔ بڑا سوال یہ ہے کہ جذبے کو ناپنے کا معیار کیا ہے؟ آخر کس معیار سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ کسی تحریر میں جذبہ ہے یا نہیں؟ جذبے کی موجودگی کا احساس کسی تحریر میں دو طرح سے ہوا کرتا ہے اوّل تو اس طرح کہ جذبے کی موجودگی مخاطب کے وجدان میں متماثل قسم کا احساس جسکو (ہم اثر و تاثیر کہتے ہیں) پیدا کر دیا کرتی ہے۔ دوسرا اس طرح کہ جذبہ عموماً اپنے اظہار کے لئے تخیل کا سہارا لیتا ہے۔ یہ تخیل تشبیہہ استعارہ وغیرہ کی مدد سے اصلی معانی میں اضافہ یا رنگ آمیزی کرتا ہے جس سے مطلوبہ اثر پیدا ہوتا ہے !

تشبیہ و استعارہ (جس میں) تو شاعری کی ملکیت ہے مگر نثر بھی اس رنگ سے خالی نہیں ہوا کرتی۔ یہاں تک کہ تاریخ، سیرت، تنقید، فلسفہ، فلسفۂ مذہبی ــــ بلکہ بعض اوقات سائنس کی کتابیں بھی اس عنصر سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔

جہاں تک میں حالی کی کتابوں کو دیکھ سکا مجھے تو اس حقیقت کا یقین ہے کہ حالی کی تمام تصانیف میں جذبے کا عنصر موجود ہے، ثبوت اس کا یہی ہے کہ اول تو ان کی بیشتر تصانیف کی بنیادی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ان میں شخصی جذبے کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حالی ایک سوانح نگار تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی شخص سوانح نگاری کے کسی موضوع کے لئے قلم اٹھاتا تب ہے جب پہلے اسے اس موضوع کے ساتھ دلچسپی ہو ــــ اور صاحب! یہ دلچسپی تفریحی تو نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ دلچسپی ہوگی جو محبت یا عقیدت کے جذبے سے ہی ابھر سکتی ہے۔ سوانح نگاری کوئی تاریخ تو ہے نہیں کہ اس میں پوسٹ مارٹم والے ڈاکٹر کی طرح محض رپورٹ کی ترتیب ہی مد نظر ہو۔ دنیا بھر سے الگ کسی ایک شخص یا دو تین اشخاص کو سوانح نگاری کے لئے منتخب کر لینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ شخص یا دو تین اشخاص مصنف کے خاص محبوب اشخاص ہیں ــــ اور جب کوئی شخص محبوبی کی صف میں شامل ہو جاتا ہے تو معلوم ہے کہ اس کی ذات ایک خاص جذبے کا محور و مرکز قرار پا جاتی ہے یہ چیز سوانح نگاری کی بنیادی ماہیت میں داخل ہے کہ اس کی اساس ایک جذباتی رشتے پر قائم ہو ــــ! تو اس صورت میں سوانح نگار حالی کو بطور خاص

اس قاعدہ کلیہ سے الگ کیوں سمجھا جائے — پھر آخر وہ بھی تو ایک سوانح نگار ہی تھے سوانح نگاری بھی جذبے کی تکمیل ہے!

خیر، یہ تو ہوا صنف اور جذبے کا سوال — مگر حالی کی تحریروں میں تخیل کی موجودگی بھی جذبے کی موجودگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ ہاں یہ تسلیم ہے کہ تخیل کی آمیزش کا انداز حالی کی تحریروں میں ان کی طبیعت اور مذاق سے مخصوص ہے۔ اور وہ اس کے لئے اپنا ایک خاص مسلک رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ جہاں شبلی اثر آفرینی کے لئے استعارہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ وہاں حالی کبھی کبھی تشبیہ سے اور اکثر تمثیل یا تشبیہ مرکب سے کام لیتے ہیں۔ اسی سے شبلی کے یہاں ایجاز اور حالی کے یہاں تفصیل یا اطناب کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں — اور یہ اطناب عیب نہیں (حالی کے یہاں تو حسن پیدا کرتا ہے)۔ اور یہی چیز حالی کے یہاں ایک تخلیقی عمل کی سی حیثیت رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی تخلیقی عمل جذبے کے بغیر ممکن نہیں۔

حالی کی یہ تمثیلیں حیات سعدی سے لے کر مقدمہ تک سبھی کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن میں چند مثالیں وضاحت کی غرض سے میں یہاں پیش کرتا ہوں

۱۔ جس طرح تلوار کا کاٹ درحقیقت اس کی دھار میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح کلام کی تاثیر اس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اس کے دل اور [illegible] زبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دل سوز آدمی کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر و سناں کا کام کرتے ہیں [illegible] کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر

ان میں کچھ بھی اثر باقی رہے سچے ناصح کے لعن وطعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔" (حیات جاوید حصہ دوم ص۲۰۱)

۲۔ (مصلح) ریفارمر اور انشاپرداز کے تخلیقی عمل سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ہے ایک سچے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشاپردازوں کے اپنے کلام کی میاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے۔ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں وہ واقعات پر تشبیہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ و قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے" (حیات جاوید۔ جلد دوم ص۲۸۹-۲۹۰)

۳۔"جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خون جگر کی چاشنی نہ ہو۔ اور جس قدر اس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اس کی درستی اور کاٹ

چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی" (حیات سعدی ص۳۰)

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ حالی کے یہاں تخیل کی خاصی رنگ آمیزی موجود ہے ـــ اور یہ رنگ آمیزی جذبے کی تحریک سے بے نیاز نہیں ہو سکتی مگر یہ صحیح ہے کہ جذبے کی آمیزش حالی کی طبعی میانہ روی کے تابع ہے اور اس میں مضائقہ بھی کیا ہے؟

اب روکھی پھیکی تحریر؟ روکھی پھیکی؛ یا دھیمی دھیمی؟ اسکا فیصلہ ضرور کرلینا چاہیئے۔ آخر حالی کی تحریر پھیکی کیوں ہونے لگی۔ پھیکی کا مطلب ہے بے مزہ۔! مگر حالی کی عبارتیں بے مزہ نہیں میں یہاں اس بات کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ حالی کی تحریروں میں استعارے کا چٹخارہ نہیں۔ طنز کی چٹکی نہیں۔ زہرناک چوٹیں اور پھبتیاں بھی نہیں ـــ اب جن لوگوں کو ان چیزوں کا مذاق ہو گیا ہے ان کو حالی کی عبارتوں میں پھیکا پن محسوس ہوتا ہے ـــ اور اس میں شاید وہ حق بجانب بھی ہوں مگر اسکی وجہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ حالی کی تحریریں واقعی، روکھی ہیں خود انکا اپنا ذوق تیز ذائقوں اور شوخ رنگوں کا دلدادہ ہے!

حاصل کلام، حالی کی انشا جذبے سے خالی نہیں، نہ وہ اتنی روکھی پھیکی بے چٹنی کہ سمجھی گئی ہے۔ اس کا عیب اگر ہے تو شاید یہ کہ حالی نے ہر موقع پر ایک ہی طرح کی مدھم روش کو ضروری سمجھا ہے حالانکہ زندگی کسی ہموار سیدھی لکیر کا نام نہیں۔ یہ تو ایک متنوع رنگ برنگ کیفیتوں کا مظاہرہ ہے ـــ اس میں ہر نوع اور ہر رنگ کے تجربے ہوتے ہیں اور لازماً اظہار کے اتار چڑھاؤ بھی مختلف قسم کے ہونے چاہئیں۔ کبھی مدھم کبھی

تیز کبھی مخروطِ انعکاس کی ضرورت ہوتی ہے کبھی معمولی روشنی سے بھی کام
چل جاتا ہے ——— مگر حالی کی رفتار ہر جگہ یکساں ہی رہتی ہے۔ ۱
——— یہ کمزوری سب سے زیادہ حیاتِ جاوید میں محسوس ہوتی ہے اور تعجب ۸
تو یہ ہے کہ ان کی سوانح عمری کے موضوع ——— یعنی سر سید جس قدر مختلف
الحیثیات شخص تھے اور ان کی زندگی جس قدر جوش و ولولہ سے لبریز تھی
اسی قدر زیادہ حالی کا قلم یک رنگ اور ان کے بیانیہ کی رفتار دھیمی اور یک
سیر ہے۔ حیاتِ جاوید میں غدر کا زمانہ بھی زیرِ بحث آیا ہے۔ کتنا ہنگامہ خیز
تھا وہ زمانہ؟ کتنی قیامتیں برپا ہوئیں؟ کیا کیا فتنے نہ اُٹھے ——— مگر حالی کی نظر
اس بلند و پست پر یوں ہموار پڑ رہی ہے گویا سب برابر ہے۔ ضیاء الاسلام صاحب
کو ان کے خطوں میں یہ کمزوری نظر آتی ہے۔ مگر مجھے تو ان کی حیاتِ جاوید میں جو
یک رنگی ہمواری نظر آتی ہے وہ تعجب انگیز ہے۔

پھر یہ بھی نہیں کہ حالی ذہانت کی تیزی سے محروم ہوں مسدس
میں اس کی ذہانت کتنی چمکیلی نظر آتی ہے ان کی غزل میں بھی کتنی برجستگی ہے۔
مگر حیاتِ جاوید کی دشواریوں نے ان کے قلم کو نہایت سست رفتار
بنا دیا ہے۔ دشواریاں! ہاں دشواریاں! سر سید کی لائف! ہشیار کہ رہ بردم
تیغ است قدم را۔ جس شخص نے کہ نکل تحریروں کی بنیاد ڈالی اس کی بیاگرافی
کو کہ نکل ہونا ہی چاہیئے مگر کیا کیا جائے ہمارے ملک کا مذاق ابھی اس کو گوارا
نہیں کرتا ——— عجب کشمکش ہے حالی کے ارادے میں سر سید کا مذہب؟
سر سید کا تصورِ تعلیم؟ سر سید کی سیاست؟ حالی کا ذہن ان سب باتوں کے

متعلق اندر سے مطمئن نہیں مگر اس کے باوجود سر سید کی شخصیت انھیں محبوب ہے ! دیکھئے حالی کے قلم کے لئے کیا کیا بیڑیاں کیا کیا زنجیریں ! ہیں جو ان کی اپنی تیار کی ہوئی ہیں ! شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ قدم پابند احتیاط ہو اجارہا ہے۔ چل بھی رہے ہیں اور سوچ بھی رہے ہیں ۔ عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔!

ہاں مگر حیات سعدی کی حالت اور ہے ! یہ کتاب اسلوب کے لحاظ سے جواں تر اور رعنا تر نظر آتی ہے ۔ تمثیلوں اور طویل تشبیہوں کے سلسلے بڑی برجستگی سے ابھر رہے ہیں اور یادگار غالب تو ہے ہی ایک انسان ظریف (یا بقول ان کے حیوان ظریف) کی لائف ! اس کتاب کے مقدمے میں زندہ دلی کا بھی تذکرہ ہے ۔ اور یادگار انھوں نے لکھی بھی اسی لئے ہے کہ قوم میں زندہ دلی کا جوہر پیدا کیا جائے ۔ اس کے لئے غالب سے بڑھکر اور کس کی لائف کارآمد ہو سکتی تھی ۔ مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کتاب کے اسلوب میں یہاں بھی گرمی نہیں غالب کے لطیفوں سے گرمی مستعار لے کر زندہ دلی کا چولھا گرم کیا ہے ۔ اور یہ بھی غنیمت ہے ! ۔ حالی اور زندہ دلی ! بہت اچھا موضوع ہے مگر اس وقت اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں ۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سر سید کے دبستان ظرافت میں شاید حالی ہی ایک ایسے شخص ہیں جو کھل کر ہنس نہیں سکتے ۔ سر سید کی ہنسی میں بڑی فراغت اور دلکشائی ہے، نذیر احمد (فرحت کے بیان کے مطابق) جب تک ہنسیں اور ہنسائیں نہیں کچھ کر ہی نہیں سکتے ۔ شبلی کی

ہنسی زہرناک ہے مگر ان کے ہر زہر خند میں زندگی اور قوت محسوس ہوتی ہے ان میں ایک حالی ہی ہیں جو مسکراہٹ کے بھی روادار ہوتے نہیں —— ان کی ہنسی میں بھی قدرے "مرثیہ پن" ہے اور یہ نظم اور نثر دونوں میں موجود ہے —— شاید مقدمہ کی نثر اس سے مستثنیٰ ہو تو ہو باقی تو ہر قسم کی تحریر میں یہ عنصر موجود ہے!

بعض اہل نظر نے ان سب چیزوں کو حالی کے خلوص سے منسوب کیا ہے —— اور میں بھی حالی کے خلوص کا معتقد ہوں۔ مگر مجھے تو کچھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ حالی کی طبیعت کو جو اصلاً بھی کچھ زیادہ گرم جوش نہ تھی (اگرچہ ان کی غزل یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس چولھے میں چنگاریوں کی کمی نہ تھی) لاہور کی "نیچر تحریک" (جس نے آزاد کی نظم کو بھی خنک بنادیا تھا) اور پھر سرسید کی استدلالی اور منطقی تحریک نے صورت سے انھیں کچھ زیادہ ہی محتاط نرم رو اور سست بنادیا تھا اس میں سرسید کا تصور کچھ زیادہ نہیں تھا۔ حالی کی طبیعت کا رُخ خود ہی اس کا ذمہ دار تھا مگر قومی تحریک سرسید ہی کے انداز ذہنی سے ہوئی چنانچہ دبستان سرسید کی ساری نثری خصوصیات کا حالی کے یہاں پہونچکر رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے

اب سب سے پہلے سادگی کو دیکھئے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں انھوں نے سادگی کے معنے بتائے ہیں:-

ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ خیال کیسا ہی

روزمرہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی" چلیے اگر سادگی کے یہی معنی ہوتے تو بھی کوئی خاص بات نہیں تھی. مگر ہر سادگی جذبے کی کسک اور گرمی سے خالی نہیں ہوتی۔ میر کی غزل کے سادہ حصے بھی کتنے گرم اور شوخ ہیں —— ! مگر حالی کی سادگی نے تو عجب صورت اختیار کر رکھی ہے۔ اور بات یہ ہے کہ حالی نے سادگی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ جذبات انگیز الفاظ و تراکیب سے بھی اجتناب کر لیا ہے۔ وہ اس طرح حقیقت نگار تو بن جاتے ہیں مگر ٹھنڈے حقیقت نگار، حالی نے نثر میں صفت مبالغہ سے کام شاید لیا ہی نہیں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ مبالغہ صرف شاعری کا وسیلہ ہے۔ یا شاید اس کا بھی نہیں یہ اگر سچ ہے تو کیفیات کی نسبت و مقدار کو ظاہر کرنے کا پھر اور کیا طریقہ رہ جاتا ہے اس کا بھی تو کچھ جواب ہونا چاہیئے!

پھر بھی حالی کی سادگی کو آپ بدصورت نہیں کہہ سکتے۔ سرسید کے یہاں سادگی بعض اوقات بدصورت بن جاتی ہے مگر حالی کی سادگی خوبصورت ہی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن منفعل سی خوبصورتی!

حالی کی سادہ نگاری کی خصوصیات میں ایک اہم چیز ان کی باتوں کا فطری انداز، بول چال میں آنے والے مانوس الفاظ! وہ عبارتوں میں خواہ مخواہ عالمانہ شان پیدا نہیں کرتے —— وہ ترکیبوں کے عربی فارسی انداز سے بھی بچتے ہیں۔ البتہ یہ بات بہت کھٹکتی ہے کہ وہ بجا و بے جا انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو کبھی اچھا اور کبھی برا معلوم ہوتا ہے!

حالی کی تحریروں میں استعارہ تو ہے مگر اس کے سلسلوں کو تفصیل میں ڈھال دینے کی عادت چونکا دینے والی کیفیت سے محروم کر دیتی ہے۔ استعارہ کا اصل رنگ اچانک پن میں کھلتا ہے۔ اور شبلی نے اس حربے سے خاص فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر حالی استعارے کی گرہوں کو کھول کر اپنے بیان کو سادہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ بس اس سے استعارہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔

اب سر سید کی نثر کی استدلالی تنظیم کا حال دیکھئے جو سر سید کے یہاں بڑی مربوط ہے۔ مگر حالی کے یہاں اس کا رنگ استدلالی سے زیادہ توضیحی ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ استدلالی نثر میں صغریٰ کبریٰ اور نتیجہ سے دلائل کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور اس کی ماہیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دلیل کا زور بتدریج بڑھتا جائے تاآنکہ فیصلے تک پہنچتے پہنچتے دلیل میں وہ بے پناہ قوت پیدا ہو جائے کہ قاری کے ذہن کو کسی مزید فیصلے، حجت یا دلیل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ توضیحی نثر میں یہ بات نہیں ہوتی ——— وہ ایک سائنسداں کا رویہ ہے جس میں نئے نئے پہلوؤں سے وضاحت کا سلسلہ قائم رکھا جاتا ہے کیونکہ کسی سائنسداں کا وضاحت یا تجزیے یا اس کے سوا کچھ مقصود نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی مقام پر پہنچ کر وہ اضطراب و اضطرار کا شکار نہیں ہوتا اس کی نثر پرسکون نثر ہوتی ہے۔ کسی جج کے فیصلے سے بھی زیادہ پرسکون!

حالی سر سید کے دبستانِ منطق کے ایک نامور فرد ہیں۔ ان کے مقاصد کے خاص مبلغ اور ان کے تعلیمی مناظروں اور مجادلوں میں شریک غالب ہے ——— مگر اس کے باوجود ان کے استدلالات میں کسی جانب دا

یا دعوے دار شخص کے بیان کا زور یا جوش نہیں۔ وہ ہر جگہ ایک سائنسداں کی طرح بس حقیقت حال یا صورت حال کے بے تعلق نگارندہ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے استدلالی سلسلے اکثر کمزور رہتے ہیں۔ ایک مثال لیجئے ـــــ ! اور وہ ہے "حرف "پس" کا استعمال جو سرسید کے یہاں ایک تہلکہ مچا دیتا ہے وہ حالی کی تحریر میں اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا مثلاً "الغرض" کا لفظ چراغ علی کی تحریروں میں یہ صورت حال غالباً اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ حالی جو اصلاً ایک معتدل المزاج شخص تھے سرسید کی عقلیت میں پھنس گئے جو ایک خشک اور ٹھنڈی چیز ہے ـــــ ! اور شاید یہ غلط نہیں کہ اس عقلیت کو جذب کر لینے میں حالی کو مشکل بھی پیش آئی اور اس سے ان کی نثر کو نقصان بھی پہنچا ـــــ شاید ان کی شاعری کے دوسرے دور پر بھی اس کا برا اثر پڑا ہے۔

حقیقت اور سچائی کی پاسداری منطقی حد تک سائنس میں تو ناگزیر ہے لیکن ادب میں سچائی کے معیار اپنے ہیں جو ضروری نہیں کہ منطق کے پابند ہوں ـــــ مگر حالی سچائی کے منطقی تصور پر اتر آئے تھے ـــــ پھر "نیچرل" مسلک کا اعتقادی۔ اس کا نتیجہ ماسوا اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ حالی ضرورت سے زیادہ فطرت پسند بن گئے تھے ـــــ اور ادب میں اتنا نیچرل ہو جانا کہ غیر معمولیت اور برجستگی کی کوئی شکل بھی روا نہ سمجھی جائے ادب اور شاعری کا خاتمہ نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال حالی نے مسدس لکھ کر قوم و ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اور سرسید کے مشن کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے مگر سرسید کی عقلیت کے سانچے میں ڈھل جانا ـــــ یہ حالی کی بڑی قربانی تھی میں نے گذشتہ سطور میں جو کچھ

عرض کیا ہے۔ اس سے حالی کی تنقیص مقصود نہیں صرف رنگ کا تعین مد نظر ہے۔ میں حالی کی نثر کو سائنسی نثر کا بہترین نمونہ قرار دیتا ہوں۔ اسلئے نہیں کہ انھوں نے سائنس کے موضوعات پر کچھ لکھا (علم طبقات الارض ایک ترجمہ ہے۔ میں اس کو یہاں نظر انداز کرتا ہوں) بلکہ اس لئے کہ ان کی نثر میں اعلیٰ درجے کی سائنسی حقائق نگاری کے جوہر موجود ہیں۔ مثلاً شخصی بے تعلقی اور سادگی معقولیت اور توازن! یہ باتیں سائنس کی توضیحی نثر کیلئے ضروری ہوتی ہیں۔ اور وہ حالی کی نثر میں موجود ہیں۔ ایک لحاظ سے سوانح عمری کا فن بھی سائنس کی حد میں داخل ہے۔ سچائی بے تعلقی، غیر جانب داری، ہو بہو بیان، جزئیات کا انتخاب کسی معقول معیار کے مطابق ---- یہ سب باتیں سائنسی طریق کار میں شامل ہیں۔ اور ایک سوانح نگار کے لئے ان سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ (خواہ وہ سوانح عمری مریم کی ہو یا قرۃ العین طاہرہ کی) یہاں تک تو سائنس داں بننا ہی پڑتا ہے۔ اور اس حد تک حالی بلاشبہ ایک سائنسی قسم کے سوانح نگار تھے بھی بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مزاج کے اعتبار سے سب سے زیادہ جس فن کے لئے موزوں تھے وہ سوانح نگاری کا فن تھا ---- طبعی شرافت، مہر و محبت اور سلامت و اعتدال کی خوبی ایک ایسا وصف ہے جو ہر سوانح نگار کے لئے ضروری ہے۔ اسی بنا پر سب کمزوریوں کے باوجود ان کی سوانح عمریاں ابھی تک اردو کی بہترین سوانح عمریاں ہیں۔ یکرنگی کا عیب بے شک انکی سوانح عمریوں کے رنگ کو زیادہ چمکا نہیں سکا یعنی ان کی تصویروں کے بعض

رُخ ادیب کے قلم کے محتاج نظر آتے ہیں حالی کی نثر کی کمزوری یہ ہے کہ وہ تصویر نہیں بنا سکتے ایک مثال لیجئے حیات سعدی میں ایک مجلس بحث و مناظرہ کا نقشہ کھینچا ہے اس بحث میں نہ وہ نوک جھونک ہے جو کسی مناظرے میں ہوا کرتی ہے۔ نہ فقرے باری ہے نہ حاضر جوابی۔ ذہانت کی شوخی و طراری ظاہر ہے کہ اگر کسی مناظرے میں یہ باتیں نہیں تو کچھ بھی نہیں اسی مناظرے کا حال بوستاں سعدی میں پڑھئے تو کچھ اور ہی مزا ہے ——!
اسی طرح حیات سعدی میں سعدی کا بیابان قید سے گزرنے کا واقعہ۔ اور سومنات کے پجاری کا واقعہ پڑھئے ان دونوں موقعوں پر حالی ادبی مصوری کی ضرورت پوری نہیں کرسکے اب آخر میں یہ سوال جواب طلب ہے کہ حالی کا نثر نگاری میں مقام کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حالی کی نثر اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود بلند پائے کی نثر ہے جس میں سچائی کو ہر شے پر مقدم رکھا گیا ہے وہ یقیناً اُردو کے بہت بڑے نثر نگار ہیں یہ حالی ہی تھے جن کے قلم نے اُردو میں خوبصورت علمی نثر کے لئے راستہ ہموار کیا۔ شبلی بھی علمی نثر اچھی لکھ سکتے تھے جیسا کہ الکلام سے ظاہر ہوتا ہے مگر وہ اشتعال اور بے محل جوش انگیزی سے بچ نہیں سکتے تھے سر سید نے اگرچہ علمی نثر کے لئے راستہ صاف کیا اور خطبات میں اور بعض مضامین تہذیب الاخلاق میں انھوں نے علمی مضامین پر قلم اٹھایا ان کی تحریروں میں بے ساختگی کا غیر ادبی انداز پیدا ہو گیا ہے —— وہ خوبصورت الفاظ کے اچھے شناسا نہیں تھے ملسکے

[redacted]

علاوہ ان کی طبیعت میں تلقین و ترغیب کا خطابتی عنصر بھی زیادہ ہے اس لئے ان کی علمی نثر خوبصورت نہیں۔ نذیر احمد بالکل ایک دوسری دنیا کے آدمی ہیں خطیب اور قصہ گو۔ اور یہ دونوں حیثیتیں علمی توازن اور بلا کم و کاست سائنسی حقیقت نگاری سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ میں نذیر احمد کو سادہ نثر لکھنے والوں میں بھی شمار نہیں کرتا اور سائنسی حقیقت کو تو وہ شاید ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ــــ! اور آخر میں اردو کا سب سے بڑا ادبی مصور، محمد حسین آزاد سو اس میں کیا کلام ہے کہ تخلیقی فن میں اُردو کا کوئی انشا پرداز اس تک نہیں پہنچ سکا ــــ مگر حقیقت اور سائنسی حقیقت؟ وہ تو حقیقت کو بھی افسانہ بنا کر پیش کرنے کے آرزو مند رہا کرتے ہیں لہذا سادہ حقیقت نگاری ان کے بس کی بات نہیں تھی ــــ! تو گویا اس میدان کا مرد اگر کوئی تھا تو خوش صفات سلیم المزاج حالی ہی تھا!

ڈاکٹر عبادت بریلوی

حالی کی تنقید

اُردو تنقید کی روایت میں حالی کی شخصیت اتنی نمایاں ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی ناممکن ہے۔ حالی کے ساتھ اُردو تنقید کا اور اُردو تنقید کے ساتھ حالی کا خیال ضرور آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حالی نے تنقید کی دُنیا میں کچھ ایسے کارہائے نمایاں کئے ہیں، اور ان کی ذات سے اُس میں کچھ ایسا اضافہ ہوا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان کا رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ یہی سبب ہے کہ حالی کے بغیر اُردو تنقید کی اور اُردو تنقید کے بغیر حالی کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ یہ بات میں نے یوں ہی نہیں کہہ دی ہے۔ اس کو ایک اہم ادبی حقیقت سمجھ کر پیش کیا ہے۔ حالی بنیادی طور پر ایک نقاد تھے۔ ان کی تنقید اور تنقیدی فکر اُن کے ادبی کاموں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی ادبی زندگی میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ صرف تنقید ہی کی حیثیت سے بلند مرتبہ نہیں رکھتی، اُس نے اُن کی شاعری اور سیرت نگاری کو بھی بلندی سے

ہمکنار کیا ہے۔ اسی کی بدولت ان کے اسلوب اور انداز بیان میں بھی ایک بلندی پیدا ہوتی ہے۔ حالیؔ کا مزاج تنقیدی نہ ہوتا تو وہ اعلیٰ درجے کے شاعر نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی شاعری میں اتنا تنوع اور اتنی ہمہ گیری نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی سیرت نگاری کو زندگی سے اتنا قریب اور حقیقت و حقیقت سے اتنا بھرپور [illegible] نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اسلوب میں اتنی سادگی اور توانائی، اتنی متانت اور روانی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ بہرحال حالیؔ کی شخصیت اور اُنکے [illegible] تنقید کا خاصا حصہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُنکی شخصیت کا اصل روپ اُن کی تنقید ہی میں بے نقاب ہوتا ہے اور تنقید بھی اپنا اصل روپ ان کی شخصیت ہی میں دکھاتی ہے۔

حالیؔ بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں۔ انھوں نے تنقید میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ اس موضوع پر اُن کی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں اور دوسری تصانیف میں جو بنیادی طور پر تنقیدی نہیں ہیں، اُن میں بھی تنقید کا پہلو خاصا نمایاں ہوتا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری اور یادگار غالب اُن کی مستقل تنقیدی تصانیف ہیں۔ حیات جاوید اور حیات سعدی اگرچہ سیرت نگاری سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان میں بھی تنقیدی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ بلکہ سیرت اور سوانح کے فن میں انھیں جو نمایاں مرتبہ حاصل ہے، اُس کا سبب بھی یہی ہے کہ ان میں تنقیدی زاویۂ نظر خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ حالیؔ نے مختلف رسائل پر [illegible] سے تبصرے بھی لکھے ہیں۔ ان تبصروں کی نوعیت بھی تنقیدی ہے اور ان میں سے بعض میں اعلیٰ درجے کی تنقید کا پتہ چلتا ہے

——— غرض حالی نے تنقید کا خاصا سرمایہ چھوڑا ہے ان سب میں اُن کی مخصوص تنقیدی انفرادیت ہر جگہ اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ ان سے حالی کے تنقیدی نظریات اور اصول تنقید کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اُنکے تنقیدی عمل اور عملی تنقید پر روشنی بھی پڑتی ہے ——— اور اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ حالی نے اصول تنقید پر بڑی حکیمانہ بحث کی ہے ۔ زندگی اور ادب شاعری اور فن کے مختلف اصولوں کو انھوں نے نہایت غور و خوض کے ساتھ پیش کیا ہے —— اور پھر اس میں نئے پہلو پیدا کئے ہیں —— نئے نتائج نکالے ہیں ——— نئی فکر اور نئے خیالات کی تشکیل کی ہے ——— اور پھر ان اصول و نظریات کی روشنی میں بعض ادبی و شعری کارناموں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے ۔ اور اس طرح اردو میں عملی تنقید کی ایک شاندار روایت قائم کی ہے ۔

جہاں تک اصول تنقید اور تنقیدی نظریات کا تعلق ہے، ان کو حالی نے صرف شعر و شاعری ہی تک محدود رکھا ہے ۔ ادب اور اس کی دوسری اصناف کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوئے ہیں، لیکن شعر و شاعری اور اس کی مختلف اصناف پر انھوں نے مفصل بحث کی ہے ——— اور اُردو کے شعری اصناف خاص طور پر اُن کے پیش نظر رہے ہیں ——— چنانچہ غزل، قصیدہ، مثنوی مرثیہ وغیرہ کے اصول انھوں نے معین کئے ہیں ۔ اور منطقی و مفکرانہ انداز میں ان پر روشنی ڈالی ہے ۔ حالی کے یہاں ان اصولوں کو پیش کرتے ہوئے ایک اصلاحی رجحان غالب رہتا ہے، اور شاید یہی سبب ہے کہ اُن میں وہ گہرائی نسبتاً کم پائی

جاتی ہے جو فلسفیانہ تنقید کا طرۂ امتیاز ہے ــــ لیکن اس میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ حالی نے اصولوں کو نہایت سائنٹفک اور تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے ۔

حالی نے فنون لطیفہ اور فنون لطیفہ میں شاعری کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اُن کے خیال میں اس کی تخلیق انسان کا ایک فطری عمل ہے ۔ اور اس کا تعلق انسانیت اور اُس کے تہذیب و تمدن سے ہے ــــ اسی لئے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں وہ بیکاری کا مشغلہ نہیں ہے ، بلکہ وہ انسان کی ذہنی اور جذباتی ، ذوقی اور وجدانی زندگی سے تعلق رکھتی ہے ــ لیکن حالی نے اس موضوع پر مفصل بحث نہیں کی ہے ــــ صرف اس خیال کی طرف اشارہ کیا ہے ــ اور اُن کی بات یہاں تک پہنچی ہے کہ شاعری کا ملکہ انسان کے اندر فطری ہے ــــ اس لئے شاعری میں جذب و اثر ہوتا ہے ۔ ــــ اس لئے اس سے موافق حال کے مطابق کام لینا چاہئے ــ شعر کا یہ نظریہ حالی کے اصلاحی میلان کا نتیجہ ہے ــــ اس کے حقیقت ہونے سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا ــــ البتہ اس خیال کو ظاہر کئے بغیر چارہ نہیں کہ حالی اِس اصلاحی رجحان کی وجہ سے شاعری کے روحانی اور وجدانی پہلو کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حالی نے شعر و شاعری کے بارے میں ایک صحت مندانہ نظریہ پیش کیا ہے ۔ حالی کے ماحول کا تقاضا تھا کہ اس نظریئے کو پیش کیا جائے ــــ اپنے اس نظریئے کو پیش کرنے میں وہ اپنے ماحول کے پابند رہے ہیں ــــ اسی لئے اُن کی تنقید میں بھی روحِ عصر کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔

اصلاحی رجحان حالی پر اس حد تک غالب ہے کہ وہ شعر کی تعریف سے قبل اُس کی افادیت کے نظریے کو واضح کرنا شروع کر دیتے ہیں ــــ اس بحث میں انھوں نے شعر و شاعری کی سماجی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے ــ اور مختلف مثالوں سے اس خیال کی وضاحت کی ہے کہ یورپ میں پولیٹکل مشکلات کے وقت قدیم سے پوئٹری کو قوم کی ترغیب و تحریص کا ایک زبردست آلہ سمجھتے رہے ہیں ــــ لیکن حالی نے درحقیقت اس بنیادی خیال کو واضح کر کے شعر و شاعری کے تاثر کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے ــــ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ شاعری کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ وہ دلوں میں اترتی ہے اسی لیے اس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں ــ اگر اس خیال کو پیش نظر رکھا جائے تو شاعری غلط راستے پہ گامزن ہو جاتی ہے ــ اُس کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ سوسائٹی کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جاتی ہے ــ قوم اور ملک کو شاعری کی اس صورت حال سے بہت نقصان پہنچتا ہے ــــ اسی لئے حالی نے شاعری کے سماجی پہلو پر بہت زور دیا ہے ــ وہ اس کو قوم و ملک کے مزاج کا ترجمان اور اس کی خصوصیات کا عکاس اور آئینہ دار سمجھتے ہیں۔

شعر کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے "شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو اُس کے تمام افراد کو جامع ہو اور مانع ہو ــــ البتہ لارڈ مکالے نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گو اس کو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن جو کچھ شعر سے آج کل مراد لی جاتی ہے اس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے وہ کہتے ہیں کہ شاعری جیسا کہ

دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری
بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے مگر مصور، بت تراش اور ناٹک کرنے والے
کی نقل شاعری کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعری کی کل کس چیز سے
بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے۔ اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر
اور ڈینٹے جیسے صناع بھی ان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے تخیلہ میں
اشیائے خارجی کا ایک ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اتار سکتے جیسا موقلم
اور چھینی سے کام لینا ہمارے خیال میں اترتا ہے لیکن شاعری کا میدان
وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وسعت کو
نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اتار سکتا ہے۔ مصور
صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر
نے اس کے لیے الفاظ مہیا کر دیئے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت
بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا
کام دے سکتی ہے اس کو تینوں سے اور باتوں میں فوقیت ہے کہ انسان کا
باطن صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ شاعری کائنات کی تمام
اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے ——— اس بحث سے حالی
نے شاعری کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ جہاں تک اس کی ماہیت کا تعلق
ہے وہ اس سلسلے میں ارسطو کے نظریۂ نقالی کے قریب تک پہنچنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ لیکن اس کی وضاحت حالی کی تنقید میں نہیں ہے۔
شاعری کو انھوں نے تین چیزوں کا مجموعہ بتایا ہے۔ تخیل کائنات کا

مطالعہ اور تفحص الفاظ ۔۔۔ تخیل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں "سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں IMIGINATION کہتے ہیں یہ قوت جسقدر شاعر میں اعلی درجے کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ اور جس قدر یہ ادنیٰ درجے کی ہوگی اسی قدر اُس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہوگی یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور تخیل شاعری کے لئے جو کام کرتا ہے، اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے، یہ اس کو مکرر ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشتی ہے۔ اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے" ۔۔۔ گویا حالی کے خیال میں تخیل موضوع کی تشکیل اور اُس کے اظہار دونوں میں بڑا کام کرتا ہے ۔۔۔

اُن کی اس بحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ موضوع اور مواد، فن اور صورت دونوں کی اہمیت کو جانتے ہیں ۔۔۔ اُن کے خیال میں ان دونوں کے بغیر اچھی شاعری پیدا نہیں ہو سکتی ۔۔۔ اسی لئے انھوں نے کائنات کے مطالعے کی شرط بھی شاعری کیلئے ضروری قرار دی ہے کائنات کا مطالعہ موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور جس کو وہ تفحص الفاظ کہتے ہیں اس کا تعلق فنی اظہار و ابلاغ سے ہے ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے بغیر شعر و شاعری کا تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

حالی نے شاعری کے لئے بعض خوبیوں کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔

یہ خوبیاں سادگی، اصلیت اور جوش ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ملٹن کے قول کو سامنے رکھا ہے اور ان پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے —— ان کے خیال میں سادگی سے مراد صرف الفاظ ہی کی سادگی نہیں ہے بلکہ خیال کی سادگی بھی ضروری ہے تاکہ موضوع پوری طرح واضح ہو کر ذہن نشین ہو سکے اصلیت سے ان کا مطلب یہ ہے کہ شعر زندگی سے مطابقت رکھتا ہو اسی کی بنیاد حقیقت و واقفیت پر استوار ہو —— اس میں زندگی کی عام باتیں ہوں —— لیکن ان باتوں کے پیش کرنے میں مبالغہ نہ ہو —— جوش سے ان کی مراد تیزی اور تندی ہی نہیں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ موضوع اور اظہار دونوں اعتبار سے شعر میں ایک بے ساختگی کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر نے کسی شدید جذبے کے ماتحت کوئی مضمون باندھا —— جوش نہ ہو تو شعر موثر پیرائے میں ظاہر نہیں ہوتا۔ ہرچند کہ یہ خیال حالی نے ملٹن کے حوالے سے پیش کئے ہیں —— لیکن ان میں شعر سے متعلق ان کے اپنے تصورات زیادہ نمایاں ہیں —— درحقیقت ان خیالات کو ان حالات نے پیدا کیا ہے جن کے سائے میں حالی زندگی بسر کر رہے تھے۔

شاعری کا مقصد حالی کے خیال میں جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے ان کے خیال میں شاعری دلوں میں امنگ اور ولولے کو پیدا کرتی ہے —— زندگی کو بسر کرنا اور مرنا سکھاتی ہے —— اس کے ہاتھوں جذبات میں ہیجان سا پیدا ہوتا ہے، اور انسان کچھ نہ کچھ کر لے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی لئے

بھی ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کا خیال پیدا کر سکتی ہے
اخلاق کو سدھارنا بھی اُس کا کام ہے — حالی لکھتے ہیں: "شعر اگرچہ براہ راست
علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن ازروئے انصاف اس کو
علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں" — اور اس خیال کو
پیش کر کے انھوں نے بعض بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں — ان کے خیال میں
شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعے
سے اخلاق پر ہوتا ہے۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے
موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔ قومی افتخار۔ قومی عزت
عہد و پیمان کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے، استقلال کے
ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا، اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں
سے حاصل نہ ہو سکیں۔ اور اسی قسم کی وہ تمام خصلتیں جن کے نہ ہونے سے
ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اُٹھتی ہے — اور جن کے نہ ہونے سے
بڑی بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے اگر کسی قوم میں
بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلا شبہ اُن کی بنیاد تو اکثر
شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے" — بہر حال حالی نے شعر و شاعری کے افادی
پہلو پر بڑے ہی منطقی انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ شعر و شاعری کا یہ افادی
نظریہ درحقیقت حالی کے زمانے کی پیداوار ہے — اُن کا ماحول اسی نظریے
کا متقاضی تھا — لیکن یہ نظریہ نیا نہیں ہے — حالی نے اس نظریے کو
یونان اور عرب کی تنقید سے لیا ہے۔ اور اپنے حالات کی روشنی میں اس کو

نئے معنی پہنائے ہیں۔

اُردو کی نظریاتی تنقید میں حالی کے تنقیدی نظریات کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے انھوں نے سب سے پہلے ان نظریات کو پیش کیا ہے۔ اُن سے قبل تنقید باقاعدگی کے ساتھ موجود نہیں تھی پھر بھلا تنقیدی نظریات یا نظریاتی تنقید کہاں سے آئی؟ — حالی کے ہاتھوں نظریاتی تنقید کا آغاز ہوا۔ انھوں نے ایسے نظریات کو پیش کیا جو اس وقت اُردو کے لئے نئے تھے اور جن کی بنیاد عقل وشعور پر استوار تھی۔ حالی کے نظریات اپنی ایک حکیمانہ اور سائنٹفک بنیاد رکھتے ہیں۔ ہر چند کے ان میں فلسفیانہ گہرائی نہیں ہے لیکن ان میں بنیادی حقائق کا اظہار ضرور ہے۔ حالی کا سماجی شعور اس میں ہر جگہ اپنے آپکو رونما کرتا ہے۔ اور ان کے اصلاحی میلان طبع کی جھلک ان میں ہر جگہ نظر آتی ہے انھوں نے شاعری کو ایک سماجی عمل بتایا ہے اس کے اصلاحی اور افادی پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے — اور موضوع اور مواد فن اور ہئیت دونوں کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا ہے — صحیح اظہار کے لئے الفاظ اور زبان و بیان کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے — اسی لئے وہ اُردو کی جدید تنقید کے پیشرو نظر آتے ہیں — آج ہمارے یہاں جو نظریات پیش کئے جا رہے ہیں ان میں اگرچہ بے شمار اثرات شامل ہیں لیکن ان میں حالی کی نظریاتی تنقید کے اثرات بھی کچھ کم نہیں ہیں اسی لئے آج اردو کے نئے سے نئے تنقیدی نظریات میں بھی حالی کی آواز کی گونج صاف سُنائی دیتی ہے۔

یہ نظریات جو شاعری کے بارے میں حالی نے پیش کئے ہیں انکی اہمیت سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان سے بھی زیادہ اہم ان کا وہ اظہار خیال ہے جو انھوں نے اُردو شاعری کی مختلف اصناف کے بارے میں کیا ہے بظاہر تو یہ مشوروں کی صورت میں ہے لیکن ان میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ پر اعلیٰ درجے کی اصولی بحثیں ہیں۔۔۔ حالی نے بڑی محنت اور کاوش سے ان اصناف کے بنیادی مقتضیات کو واضح کیا ہے اور اس طرح ان کے بنیادی اصولوں کو معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے یہاں تنقید کا عملی پہلو بھی جگہ جگہ نمایاں ہو گیا ہے ۔۔۔ اردو شاعری کی اصناف سخن پر ایسی سیر حاصل بحث ساری اُردو تنقید میں کہیں اور نہیں مل سکتی ۔۔۔ اس بحث میں خاصی تفصیل و جزئیات ہے ۔۔۔۔ اسی لئے یہ حالی کا ایک بہت بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔

غزل کو حالی نے محدود کر کے نہیں دیکھا ہے۔ ان کے خیال میں غزل کی صنف اپنے اندر معنوی وسعتیں رکھتی ہے۔ اس میں مضامین کا تنوع ہوتا ہے زندگی کے تمام پہلو اس کے دامن میں جگہ پاتے ہیں ۔۔ اس کی عشقیہ بنیاد کو حالی نے ضروری قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ غزل میں عشقیہ معاملات کو پیش کرنے میں عمومیت کا ہونا ضروری ہے۔ غزل میں اس طرح بڑی وسعتیں پیدا ہو سکتی ہیں جہاں تک خالص عشقیہ مضامین کو پیش کرنے کا تعلق ہے، وہ اس میں خلوص اور صداقت کو اہمیت دیتے ہیں ۔۔ ان کے خیال میں "ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی، یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں بوالہوسی کی قابلیت

نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلے اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے ۔۔۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع لفظوں میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں ۔۔۔ اسکے علاوہ انھوں نے غزل کے مختلف موضوعات اور مضامین اور ان کو پیش کرنے کے مختلف اسالیب پر بھی بحث کی ہے اور پھر آخر میں قصیدے اور مرثیے کے اصول بھی پیش کئے ہیں ۔۔۔ لیکن ان اصولوں کو پیش کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا ہے پھر بھی بعض بنیادی باتیں انھوں نے اس سلسلے میں کہہ دی ہیں ۔۔۔ غرض حالی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اُردو کے اصناف ادب پر روشنی ڈالی ہے ان کے اصولوں کو معین کیا ہے ، اُن کی عملی تنقید بھی کی ہے اور اس سلسلے میں بھی بعض بڑے نکتے پیدا کئے ہیں ۔

عملی تنقید کے ایک علمبردار کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اُن کے یہاں اس کا بنیادی سرمایہ موجود ہے ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے عملی تنقید کا پہلو خود مقدمۂ شعر و شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے خصوصاً اردو کی مختلف اصناف ادب پر جو بحث انھوں نے کی ہے ، اس میں تو عملی تنقید کے بہت ہی اچھے نمونے موجود ہیں ۔ غزل ، مثنوی ، قصیدہ وغیرہ پر جیسی عملی تنقید حالی نے کی ہے ، اس کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی ہے اسکے علاوہ جو کتابیں انھوں نے سیرت پر لکھی ہیں ، ان میں بھی عملی تنقید کا پہلو جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے جس میں

اور تقریظوں میں بھی عملی تنقید کی خاصی فراوانی ہے۔ غرض حالی نے نظری اور اصولی تنقید کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کا بھی خاصا سرمایہ چھوڑا ہے۔

ان کی اس عملی تنقید میں سب سے زیادہ نمایاں یہ بات ہے کہ وہ کسی خیال کا اظہار اصول اور نظریات کے حدود میں رہ کر کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر شاعر اور شعری تخلیق کو ان اصول و نظریات کی روشنی میں دیکھا ہے جو انھوں نے قائم کئے ہیں اسی لئے ان کی عملی تنقید میں ان نظریات کی بحث جگہ جگہ شروع ہو جاتی ہے۔ اور ان دونوں کی ہم آہنگی ان کی تنقید کا نمایاں پہلو ہے۔

حالی نے شاعری کے لئے اصلیت، سادگی اور جوش کو ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ غزل پر جو عملی تنقید انھوں نے کی ہے، اس میں ہر جگہ ان تینوں خصوصیات کو تلاش کیا ہے۔ جب وہ غزل پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں "ملک میں نیچرل شاعری کو پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کئے جائیں اس کو تمام انسانی جذبات ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے کہ ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو"۔ تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے بارے میں قائم کئے ہوئے اپنے اصولوں کو اس سلسلے میں پیش نظر رکھا ہے۔ حالی مثالی غزل اسی کو سمجھتے ہیں جس میں یہ خصوصیات موجود ہوں۔

سوانح عمریوں میں جو تنقید انھوں نے کی ہے وہاں بھی وہ اس راستے سے الگ نہیں ہٹے ہیں۔ یادگارِ غالب اس اعتبار سے شاید ان کی

سید علی عباس حسینی

مجالس النساء

مولانا نذیر احمد کی مراۃ العروس اور بنات النعش کی عام مقبولیت نے کئی اور صاحبان قلم کو بیبیوں اور بچیوں کے لئے تعلیمی کتابیں قصّوں کہانیوں کی صورت میں لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ ان میں سے شاد عظیم آبادی کی "صورت الخیال" "ہیئتہ المقال" اور "حلیتہ الکمال" اور مرزا عباس حسین ہوش کی کتاب "ذمانہ طاہرہ" اور حالی پانی پتی کی "مجالس النساء" خاص مقام رکھتی ہیں۔

مجالس النساء کا قصّہ پلاٹ کے لحاظ سے بہت ہی پتلا ہے، ایک آتو جی کچھ بچیوں کو تعلیم دینے کے سلسلے میں سید عباس کی زبانی اس کی ماں کی تعلیم و تربیت کی روداد بیان کرتی ہیں پھر اسی سید عباس سے انکی تربیت و تعلیم کا حال کہلاتی ہیں۔ زبیدہ دلّی کے ایک رئیس خواجہ فضیل کی لڑکی تھیں۔ خواجہ فضیل کے دوسرے بھائی خواجہ کمیل تیس بتیس برس کے سن میں دلی چھوڑ کر دفعتاً کہیں باہر چلے گئے اور لاپتہ ہو گئے۔ ساری جائداد پر خواجہ فضیل ہی کا قبضہ تھا۔ خاصے دولت مند تھے لیکن کوئی اولاد نہ تھی، بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا بھی ہوئی تو زبیدہ۔ ماں

اپ دونوں ان پر جان چھڑکتے تھے، لیکن ان کا لاڈ پیار کبھی عقل و خرد کے حدود سے آگے نہ بڑھا۔ انھوں نے ساری محبت زبیدہ کو ایک مثالی گھر دار بنانے پر صرف کی۔ جب وہ پڑھ لکھ کر سیانی ہوئی تو شادی سے پہلے ہی ماں نے انتقال کیا۔ اس نے سارا گھر بڑی خوبی سے سنبھال لیا۔ خواجہ فضیل نے امجد علی نامی ایک نوجوان سے جو تجارت پیشہ ہونے کے باوجود علم و ہنر کی دولت سے بھی مالا مال تھا، کر دی۔ زبیدہ نے نیک سیرت شوہر کے ساتھ بیس بائیس برس ہنسی خوشی کی زندگی بسر کی۔ شادی کے اٹھارویں انیسویں سال سید عباس پیدا ہوئے، یہ ابھی تین چار برس کا تھا کہ باپ نے رحلت کی اور سولہ برس کی عمر تک ان کی تعلیم و تربیت بیوہ ماں کے ذمہ رہی زبیدہ کی تعلیم و تربیت حصّہ اول میں بیان کی گئی ہے۔ یہ حصّہ گویا لڑکیوں کے لئے ہے۔ حصّہ دوم میں سید عباس کی تعلیم و تربیت کا حال ہے۔ یہ حصّہ لڑکوں کے لئے لکھا گیا ہے۔

حالی کے تعلیمی پروگرام کو سمجھنے کے لئے ان حصوں سے اقتباسات حاضر ہیں۔ ان سے بہت کچھ حالی کے اصول تعلیم پر روشنی پڑے گی۔

۱۔ زبیدہ کے پیدا ہونے کے بعد دودھ پلانے کا سوال اٹھا۔ اس کیلئے انّا تلاش کی جانے لگی۔ خواجہ فضیل کی نظر میں انّا میں چند خصوصیتیں ہونا ضروری تھیں۔ وہ زبیدہ کی ماں سے کہتے ہیں۔

• کچھ نہیں تو انا میں یہ دو باتیں ہونی بہت ضروری ہیں۔ اول تو قوم سے شریف ہو، دوسرے خوش مزاج اور غیرت دار ہو۔"

جب حسینی خانم ان خصوصیتوں کی اتا مل گئی تو ان کی خاطر تواضع میں کسی طرح کی کمی نہ کی گئی۔ سید عباس کا بیان ہے:

"نانی صاحبہ ان کی کمال خاطر داری کرتی تھیں۔ جو آپ کھاتیں وہی ان کو کھلاتیں۔ جو آپ پہنتی وہی ان کے لئے بنواتیں۔ جو کپڑا میری والدہ کے لئے بنتا اس کے ساتھ کا ان کے کوکا کے لئے پہلے بنتا۔" اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ "آخر وہ بھی انھیں کی ہو رہیں۔ ساری عمر اسی گھر میں کاٹ دی۔"

زبیدہ کے لئے انا کے انتخاب میں جس اہتمام سے کام لیا گیا تھا وہی اس کی تعلیم و تربیت کے ایک ایک جزو کے معاملے میں کیا جاتا تھا کھیلوں کے سلسلے میں جو گڑیاں زبیدہ کو دی گئی تھیں ان کا حال زبیدہ ہی سے سنئے:

"ہمارے ہاں جو مغلانی نوکر تھی وہ سینے پرونے کے کام میں نہایت ہوشیار تھی۔ اماں جان نے اس سے میرے لئے کپڑے کے کھلونے سلوا کر ان پر روغن پھروا دیا تھا مگر ان کے نام ہی نرالے تھے جو بہت بری صورت کے تھے اور ان کے دیکھنے سے نفرت آتی تھی، ان میں کسی کا نام تو غصہ تھا کسی کا نام بد زبانی، کسی کا نام غیبت تھا کسی کا نام جھوٹ، کسی کا نام شوخی کسی کا نام کتری، کسی کا نام پھوہڑ، کسی کا نام ہٹ، کسی کا نام زبان دراز، کسی کا نام کام چور، کسی کا نام سستی، کسی کا نام کاہلی، انھیں میں ایک کھلونا دو چھپکلیوں کی شکل کا تھا، اس کا نام لڑائی جھگڑا تھا۔ اس کی صورت سے صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ دو چھپکلیاں لڑ رہی تھیں اس کے جھونٹے اس کے ہاتھ میں ہیں، اس کے جھونٹے اس کے ہاتھ میں۔ اور ایک گھوڑا بھی انھیں

میں تھا۔ اس کی عجیب صورت تھی بھٹی بھٹی آنکھیں بھیانک صورت، بال بکھرے ہوئے زبان باہر کو نکلی ہوئی۔ اس میں ایک کل لگی ہوئی تھی، جہاں اسے دبایا وہ بھاگا، دو گز تک تو وہ ایسا جاتا جیسے ناوک کا تیر اور پھر منہ کے بل گر کر لوٹ پوٹ ہو جاتا، اس کا نام جلد باز تھا۔ اور جن کی صورتیں اچھی تھیں ان میں کسی کا نام توحیا تھا، کسی کا نام غیرت کسی کا نام سلیقہ کسی کا نام صفائی، کسی کا نام پارسائی کسی کا نام تحمل تھا۔ کسی کا نام صبر کسی کا نام قناعت، کسی کا نام سلوک، کسی کا نام ملاپ، کسی کا نام فرمانبردار۔ انھیں میں ایک کھلونا ہرن کی صورت کا تھا۔ اس کے تیور سے صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اڑ جائے گا، اس کا نام چستی تھا اور انھیں میں ایک نہایت خوبصورت پری تھی وہ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی مسکراتا ہو اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اسے دیکھے جائے۔ اس کا نام ہنس مکھ تھا۔"

سید عباس ان کھلونوں سے کھیلنے کا فائدہ جاننا چاہتا تھا۔ زبیدہ اس پر یوں روشنی ڈالتی ہے:

"یہ اس لئے بنوائے تھے کہ مجھے بُری باتوں سے نفرت ہو جائے اور نیک عادتیں اختیار کروں ... آج تک ان کی صورتیں میرے دل سے نہیں بھولیں۔ جب کوئی کسی پر غصہ ہوتا ہے تو وہی کھلونا جس کا نام غصہ تھا اس کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے یا جب دو عورتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں تو انھیں دو چڑیل پائیوں کی شکل میرے روبرو آن کھڑی ہوتی ہے۔ یا جب کوئی کام بولایا ہوا کرتا ہے تو اسی گھوڑے

کی تصویر میرے آگے آجاتی ہے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کھیل ہی کھیل میں کیسی کیسی اخلاقی تعلیم دی گئی — !

اب سات آٹھ برس سے اوپر کی لڑکیوں کا تعلیمی نصاب بھی زبیدہ کی زبانی سنیئے:-

"جب آٹھواں سال لگا تو میرے سارے وقت رک گئے۔ صبح کو چھ بجے سے نو بجے تک تو مجھے استانی جی قرآن شریف پڑھاتیں۔ پھر ایک گھنٹے مغلانی کچھ سینا پرونا سکھاتیں۔ دس بجے کھانا کھانے کے بعد مجھ کو اماں جان نے کھیلنے کی چھٹی دے رکھی تھی، پر میں اپنی خوشی سے اکثر مغلانی کے پاس چلی جاتی اور کچھ نہ کچھ سینا لے بیٹھتی۔ گیارہ بجے ابا جان دیوان خانے سے محلسرا میں سونے کو تشریف لاتے تھے۔ وہ مجھ کو اپنے پلنگ کے برابر فرش پر بٹھا کر اپنے سامنے نسخ اور نستعلیق کی مشق کراتے جب تک وہ جاگتے رہتے میرے حرفوں کو دیکھتے رہتے، جہاں میرا ہاتھ بہکتا وہیں ٹوک دیتے۔ جب انکی آنکھ لگ جاتی میں آپ بیٹھی مشق کیا کرتی۔ ایک کے عمل میں وہ اٹھتے تھے میں جب تک وہیں بیٹھی لکھا کرتی۔ جہاں وہ ذرا ہوشیار ہوئے اور میں تختی دوات قلم رکھ کر نماز کو اٹھی۔۔۔ ظہر کی نماز کے بعد استانی جی سے اردو مسائل کی کتاب کا سبق لیتی۔ تین بجے تک انکی خدمت میں رہتی۔ جب قرآن شریف ختم کر چکی اور نماز روزہ اور نہانے دھونے کے مسئلوں سے باخبر ہو گئی تو ابا جان نے مجھے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ اور فارسی اور حساب شروع کرایا۔ اور یہ فرمایا کہ اپنے سبقوں سے فراغت پا یا کرو تو گھڑی —

آدھ گھڑی کو چار درویش یا اخلاقِ محسنی کا ترجمہ لے بیٹھا کرو اور اپنے آپ دیکھا کرو۔ جو حرف سمجھ میں نہ آیا وہ استانی جی سے پوچھ لیا۔ میرا جی ان کتابوں میں خوب لگا تھا۔ وہ تو گھڑی آدھ گھڑی کے لئے کہتے، میں گھنٹے گھنٹے بھر انھیں میں لگی رہتی۔ تین بجے مجھے چھٹی ہوتی تھی، اس میں کبھی تو مغلانی پاس جا بیٹھی کچھ ان کا کام بنوا لیا۔ اور کبھی جو ہمارے یہاں کنبے کی لڑکیاں آگئیں اور میرے بہت ہی گرد ہوئیں تو ان کے ساتھ گڑیاں کھیلنے لگی۔ جب عصر کی نماز پڑھ چکی، اب باورچی خانے میں جا کر ماماں کو مصالحہ پیستے، ہانڈی چڑھاتے گوشت بھونتے دیکھتی اور نمک پانی اور آنچ کا اندازہ نگاہ میں رکھتی رفتہ رفتہ سارا کام باورچی خانے کا اپنے ہاتھ سے کرنے لگی، دال دلتی مصالحہ پیسنا، چولھے میں آگ سلگانی، ترکاری چھیلنی، پیاز کترنی، گھی داغ کرنا، کباب بنانے، یخنی چڑھانے، چانول پسانے، پلاؤ دم کرنا ... یہ سب کام آپ کرتی۔ غرض جب سب کھانے سے فراغت پا چکتے تو رات کے نو دس بجے تک اماں جان کے پاس بیٹھنے کا معمول تھا، وہ باتوں ہی باتوں میں مجھے ہر طرح کی نصیحت کرتی رہتی تھیں اور سب سے زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق دلاتیں۔ اول تو انھوں نے میرے لئے ایک چھوٹی سی الماری بنوائی اور ابا جان کے کتب خانے میں جتنی چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں ان سب کی خوبصورت خوبصورت جلدیں بندھوائیں، کسی کا رنگ سبز کسی کا رنگ سرخ کسی کا زرد، کسی کا آبی، کسی کا بادامی، اور سب پر سنہری چھاپا کیا ہوا۔ غرض وہ سب کتابیں میری الماری میں چن دیں اور کہا "بیٹا یہ الماری تمہاری ہے

لئے ہے اور لو اس کی کنجی بھی تم ہی اپنے پاس رکھو۔ اگر میں نے استانی جی سے تمہاری کچھ بھی فریاد سُنی تو اماری چھین لوں گی۔"

اسی تعلیم کے سلسلے میں جاہل عورتوں کی توہم پرستی کا بھی ذکر آگیا ہے حالی نے ان کے بیان میں ایسی ایسی چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا موجودہ مستورات کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ انھیں یہاں نقل کردینا علم انسانیت کے طلبا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ زبیدہ کی والدہ اپنی بیٹی کو جاہل عورتوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے منع کرنے کے سلسلے میں کہتی ہیں۔

"ایک نیا مذہب، سارے جہاں سے نرالا، ساری خدائی سے انوکھا، نہ جس کا قرآن میں پتہ، نہ جس کا حدیث میں ذکر، وہ البتہ سیکھ جاؤ گی۔" میں نے کہا "اماں جان!" کیا عورتوں کا مذہب دور پار سب سے جدا ہے؟" کہا "بیٹیا! کیا تم نے ان کے مسئلے نہیں سُنے؟ ایک بات ہو تو کہوں انھوں نے تو ہزاروں خرافات جوڑ رکھے ہیں۔ قینچی نہ بجاؤ، دسپنا نہ بجاؤ، چاقو سے ناخن نہ لو، ٹھلیا پر ہاتھ دھر کے پانی نہ پیو، یہ سب باتیں نحوست کی نشانی ہیں۔ ننگے سر پانی پیو تو سر پر ہاتھ رکھ لو، چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے نہ ہو، اور بھولے سے رکھ دیا ہو تو دونوں ہاتھوں کو چوم لو۔ دو آدمیوں کے بیچ میں سے آگ نہ نکالو، نہیں تو ان میں لڑائی ہو جائے گی۔ چھلنی سر پر نہ رکھو نہیں تو گنج ہو جائے گا، ترازو دے کھڑے ہو کر نہ تولو، نہیں تو برکت جاتی رہے گی، کھانا کھا کر انگڑائی نہ لو، نہیں تو کھایا پیا سب کتے کے پیٹ میں چلا جاوے گا۔ جھاڑو کو بدن سے

نہ لگنے دو، نہیں تو بدن سنیک سا ہو جائے گا۔ روئی کو بدن سے نہ لگنے دو
نہیں تو کھانے کا ہوکا ہو جائے گا، ٹھکرایا ہوا یا لانگا ہوا پانی نہ پیو۔ جس
پلنگ پر بچہ سوتا ہو اسے پٹیاں پکڑ کر نہ اٹھاؤ۔ اور جو اٹھا لیا تو دونوں
طرف سے ہاتھ ملا کر چوم لو۔ جس پانی کو تین ہاتھ لگ جائیں اسے پھینک دو
یا چوتھا ہاتھ لگاؤ۔ کہیں بیٹھ کر پاؤں نہ ہلاؤ، رزق ہلتا ہے۔ چراغ کو پھونک
مار کر نہ بجھاؤ، منہ میں بدبو آنے لگے گی۔ بچوں کو دودھ دہی چاول کھلاؤ
تو راکھ چٹا دو، نہیں تو نظر ہو جائے گی۔ بدن میں کپڑا سینے سے غیبتی آتی ہے
گھر میں سیہہ کا کانٹا رکھنے سے لڑائی ہوتی ہے۔ جس پر مرت بیاہی کا آنچل
پڑ جائے اس کا بچہ بیمار ہو جائے گا۔ نہیں تو آنچل کا کونا کتر کر جلا دو۔ کسی
کسی کے ہاں مہمان جاؤ تو تیسرے دن نہ آؤ۔ بدھ کے دن کسی کے ہاں
نہ جاؤ۔ دلہن کا جوڑا سیو تو سات سہاگنوں کا ہاتھ لگا لو، صبح کو کوا بولے
تو جانو کوئی عزیز پردیس سے آنے والا ہے، اس کے سامنے سب پردیسیوں
کے نام لینے شروع کرو، جس کے نام پر وہ اڑ جائے، وہی آئے گا۔ صبح
اٹھتے ہی حکیم کا نام لو تو چیرے والا اور دھوبن کا نام لو تو اجلی کہو۔
چاند کو اوپر والا، سانپ کو رسی، ہیضہ کو تتکارا۔ مسان کو نتاوان کہو
رات کو کتے بھونکیں تو جانو راہیں شیطان دکھائی دیتا ہے۔ تو چولھے
سے اتر کر بیٹھے تو جانو کچھ خوشی ہونے والی ہے۔ اٹھتے ہوئے کوئی چھینک
دے تو بیٹھ جاؤ۔ الٹی چارپائی کھڑی نہ کرو، نحوست کی نشانی ہے۔ کپڑا
بیونتو تو زمین کو چھو لو۔ پانی میں منہ نہ دیکھو، دوا پیو تو کٹورا الٹ دو۔

پاؤں پر پاؤں نہ دھرو۔ نحوست آتی ہے، جوتی پر جوتی چڑھ جائے تو جانو کہیں سفر کرنا ہے۔ کنگھا کسی کے اوپر سے نہ دو نہیں تو صدقہ ہو جائے گا کسی پر سے لانگ کے نہ جاؤ نہیں تو سر دکھے گا۔ ناک کھجلائے تو باہر سے آئے ہوئے مرد کی جوتی سے سات بار چھوا لو نہیں تو بیمار ہو جاؤ گے ٹھلیا نہ بجاؤ نحوست آتی ہے۔ جس نے دوسرا نکاح کیا ہے اسے بی بی کی صحنک پر نہ بٹھاؤ، تیسری، تیرھویں، تیئیسویں اور آٹھویں، اٹھارویں، اٹھائیسویں یہ سب تاریخیں نحس ہیں۔ ان میں کوئی نیا کام نہ کرو۔ بدھ کے دن سفر کو نہ جاؤ۔ جمعرات کو مسہل نہ لو، حکیم کے یہاں نہ جاؤ فصد نہ کھلواؤ۔ رات کو اودائیں نہ کھینچو۔ چھپکلی کپڑوں پر گر پڑے تو سونے کا پانی بدن پر ڈالو۔ ہچکیاں آئیں تو جانو کوئی یاد کرتا ہے، مکھی منہ میں چلی جائے تو جانو کچھ مٹھائی کھائیں گے۔ بچے کی آنکھیں دکھیں تو چھوت جھاڑو۔ بچے کے چیچک نکلے تو گوشت نہ بگھارو۔ اجلے کپڑے پہن کر آؤ، نہا کر نہ آؤ، پلنگ پر جھاڑو نہ دو، نحوست آتی ہے، کوری ٹھلیا بھری جائے تو پہلے کسی مرد کو پانی پلا دو۔ کسی کی ناک کو اپنا ہاتھ لگ جائے تو اس کا ہاتھ اپنی ناک کو لگا لو نہیں تو وہ بیمار ہو جائے گا۔ غرض کہ اسی طرح کی سیکڑوں باتیں ہیں، کہاں تک بیان کروں۔"

یہ ساری نصیحتیں کرکے ماں تو دنیا سے سدھاریں مگر زبیدہ کے باپ نے بھی نگہداشت میں کوئی کمی نہ کی ہر موقع و محل پر اخلاق و آداب شریعت و آئین کا خیال رکھا۔ زبیدہ کی شادی میں حماقت آب رسموں سے خود ہی پرہیز

نہ کیا بلکہ سدھی کو بھی بے جا نمود و نمائش سے اجتناب پر راضی کر لیا لیکن سب سے بڑا جو اصلاحی اقدام جو حالی نے اس قصہ کے ذریعے تجویز کیا ہے وہ شادی بیاہ میں لڑکیوں سے صاف صاف ان کی منظوری لینے کا مسئلہ ہے۔ سید عباس کا بیان ہے کہ نکاح سے پہلے خود خواجہ فضیل صاحب اندر محلسرا میں تشریف لے گئے اور صاحبزادی سے فرمایا۔

"بیٹا تم خدا کے فضل سے پڑھی لکھی قابل اور ہوشیار ہو ہر ایک بات کی برائی بھلائی کو خوب جانتی ہو تم کو زیادہ سمجھانے کی کچھ ضرورت نہیں میر سید علی کے گھرانے کا حال تمہاری اماں اور بہنیں تم سے سب کچھ کہہ چکی ہیں ان کے ہاں کے مرد و عورت کا چال چلن جو میں نے سنا ہے بہت اچھا ہے آگے خدا کو علم ہے اور ان کا بیٹا امجد علی بھی ظاہر میں نہایت سعادتمند اور اہل معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ نکاح کا وقت ہے اس وقت تم سے پوچھ لینا شرط ہے۔ جو کچھ تمہاری مرضی ہو بے تکلف کہہ دو۔" جب زبیدہ شرم مار دو بارہ اس طرح یہ پوچھنے پر بھی نہ بول سکی تو خواجہ فضیل نے کہا "بس یہ بے محل شرم و حجاب کہاں تک رہے گا؟ باہر دس بھلے مانس بیٹھے راہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر سو دفعہ تمہارا دل ٹھکے تو اس بات کو قبول کرو، نہیں تو جواب دو، میں ابھی لوگوں کو ایک خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیتا ہوں۔ خدا نخواستہ تم پر کوئی بات نہیں آنے کی۔ بیٹی نے جب باپ سے یہ کلام سنا، ان کی ناخوشی کے آگے برادری کے طعنوں کا کچھ خیال نہ کیا اور صاف صاف ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضور نے لونڈی کے

حق میں جو کچھ تجویز کیا ہے عین مصلحت ہے۔ آگے ہونا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہے۔"

حالی نے اس مسئلے میں وہ اخلاقی جرأت دکھائی ہے جو اب بھی نام نہاد "شرفاء" میں مفقود ہے۔ افسوس ہے کہ اس بیسویں صدی میں بھی یہ بے محل شرم اور یہ بیجا غیرت ہزاروں شریف زادیوں کی زندگی کی بربادی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ شادی بیاہ کے معاملہ میں حکم شرع پر اور قانون حکومت پر مکمل طور پر عمل کیا جائے۔

مجالس النساء کے حصۂ دوم میں سید عباس کی تعلیم و تربیت بیان کی گئی ہے۔ حالی نے نو برس تک کی تعلیم کی تفصیلات غالباً اس لئے زیادہ دی ہیں کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر ماں خود پڑھی لکھی ہوگی تو وہ اپنے لڑکوں کو کس کس طرح کی تعلیم دے سکے گی اور اس کی نگرانی میں ان کی کیسی تربیت ہو سکے گی۔ سید عباس نے نو برس کے سن تک تو گھر پر تعلیم پائی۔ پھر مدرسے میں داخل کر دئیے گئے۔ وہاں کی تعلیم کی تکمیل بھی نہ کرنے پائے تھے کہ سولہ برس کے سن ہی میں انھیں ماں کے حکم سے حیدرآباد دکن جانا پڑا۔ لاتیہ خواجہ کسل کے صاحبزادے خواجہ ہزرلی کے متعلق خبر ملی تھی کہ وہ حیدرآباد میں ہیں۔ زبیدہ نے جو بغیر سیاحت تعلیم کو نامکمل سمجھتی تھی اکلوتے بیٹے سید عباس کو ماموں کو دلی لانے کے لئے بغیر کسی تشویش و پریشانی کے دکن روانہ کر دیا وہ اپنے دو ہمراہیوں کے ساتھ جب حیدرآباد پہنچا تو معلوم ہوا

ہزمل حج کے لئے جا چکے۔ اس نے طے کیا کہ وہ ان کا وہاں بھی تعاقب کرےگا۔ چنانچہ ہمراہیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر یہ تینوں بمبئی کے قصد سے چلے۔ راستے میں ایک دلدل میں پھنس کر سید عباس ہمراہیوں سے الگ ہوگیا۔ وہ سمجھے یہ سیدزادہ مرگیا اور مارے شرم کے دلّی نہ گئے بلکہ عراق و عرب، شام و روم میں گھومتے پھرے، ایک دن وہیں سید عباس سے ملاقات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ وہ تنہا مکہ تک ماموں کی تلاش میں گئے اور وہاں سے ان کو ساتھ لیکر مختلف شہروں کی سیر کرتے اب استنبول میں آکر ترکی سرکار کے ملازم ہوگئے ہیں۔ ہمراہیوں کے یاد دلانے پر انھیں ماں کا خیال آیا، ہزمل کو بھیجکر انھیں بھی وہیں بلوالیا اور سب آرام خوشی سے رہنے لگے۔

قصے میں کہیں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے نہ راستے کے مناظر کا بیان ہے نہ مختلف شہروں کی عمارتوں اور معاشرت کا۔ بس سارا زورِ قلم سید عباس کی ابتدائی تعلیم اور تربیت پر صرف کیا گیا ہے اسی کا اقتباس ملاحظہ ہو اس سے اس نصاب اور طریقہ تعلیم پر روشنی پڑتی ہے جو حالی لڑکوں کی تعلیم کے لئے مناسب سمجھتے تھے۔۔ سید عباس کا بیان ہے کہ۔۔

"نو برس کی عمر تک میری والدہ نے مجھ کو مکتب میں نہیں بٹھایا بلکہ آپ ہی پڑھاتی لکھاتی رہیں تین گھنٹے دوپہر سے پہلے اور دو گھنٹے دوپہر کے بعد۔ یہ پانچ گھنٹے تو میرے پڑھنے لکھنے کے تھے اس کے سوا صبح سے لیکر رات کے دس بجے تک میرے تمام اوقات اور کاموں میں صرف

ہوتے تھے. صبح کی نماز کے بعد ایک آدمی کو ساتھ لیکر جنگل کی ہوا کھانے جاتا تھا
اور سورج نکلتے ہی الٹا پھر آتا تھا۔ وہاں سے آتے ہی گرم پانی سے نہاکر اجلے
کپڑے پہنے اور جو کچھ ناشتہ تیار ہوا وہ کھالیا۔ اس میں اکثر سات بج جاتے
تھے اب میرے پڑھنے کا وقت آیا دس بجے تک مجھکو اماں جان برابر
پڑھاتی رہتی تھیں اس کے بعد میں اور میری انا کا بڑا بیٹا غلام امام جو میرے
کوکا سے عمر میں ایک برس بڑا تھا گیارہ بجے تک برابر اصطبل میں کھیلتے رہتے
تھے. گیارہ بجے وہاں سے آکر کھانا کھایا پھر بارہ بجے تک اخبار دیکھتا رہا
اس کے بعد ہمارے پڑوس میں ایک خوشنویس رہتے تھے ان کے یہاں جاکر
نستعلیق کی مشق کرتا تھا ایک بجے وہاں سے آتا تھا۔ ظہر کی نماز پڑھ کر
تین بجے تک پھر اماں جان پڑھاتی رہتی تھیں. تین بجتے ہی پڑھنے سے مجھے
چھٹی ہوجاتی تھی اب پانچ بجے تک میرا اپنی بندوق سے کام رکھتا تھا۔
اسلام بیگ جو ابا جان کے وقت سے ہمارے ہاں نوکر تھا اس کو بندوق
کافی خوب آتی تھی. وہ مجھ کو اصطبل میں لے جاکر نشانہ لگانا سکھاتا تھا
اسی میں عصر کی نماز بھی پڑھ لی پانچ بجے کے بعد اگر گرمی کا موسم ہوا تو نہاکر
اور نہیں تو اسی طرح گھوڑے پر سوار ہوکر شہر کے باہر ہوا کھانے چلا جاتا
تھا شام کو وہاں سے آکر مغرب کی نماز پڑھی پھر کھانا کھایا کھانے کے بعد تھوڑی
دیر صحن میں ٹہلتا رہا۔ اس میں عشاء کی نماز کا وقت بھی ہوگیا۔ پہلے وضو
کرکے نماز پڑھی پھر ایک گھنٹے کتاب کا مطالعہ دیکھا۔ اس کے بعد اماں جان
کی خدمت میں جا بیٹھا۔ اب دس بجے تک ان کی باتیں سنتا رہا۔ دس بجتے ہی چلا

پھر میں اپنے پلنگ پر جا کر سو رہتا تھا۔ ۔ ۔ کھیلنے کی یہ صورت تھی کہ ہمارے رہنے کے مکان سے تھوڑی دور ایک بہت بڑا کچا احاطہ گھرا ہوا تھا ۔ ۔ وہاں ہم نے ایک اکھاڑا بنا رکھا تھا۔ وہیں کھیلتے تھے وہیں کشتی لڑتے تھے۔ ہمارے ساتھ جو آدمی رہتا تھا اس کو اماں جان کا یہ حکم تھا کہ گیند بلا یا کبڈی یا بھاگ دوڑ یا کشتی کے سوا اور کوئی کھیل نہ کھیلیں، اسلام بیگ جو مجھ کو بندوق لگانی سکھاتا تھا، اس کو بندوق کے بڑے بڑے کرتب یاد تھے۔ مگر اماں جان نے یہ کہہ رکھا تھا کہ اس کو فقط سیدھا نشانہ لگانا سکھا دو اور کرتب ورتب میں نہیں چاہتی۔ اسی طرح چابک سوار ۔ ۔ ۔ کو بھی تاکید تھی کہ لڑکے کو اتنا کر دو کہ گھوڑے پر ران خوب جمنے لگے۔ باگوں کا حساب اس کی سمجھ میں آ جائے۔ نشست بے قاعدہ نہ ہو، دلکی، سرپٹ، گنت، پھرت کسی بات میں عاجز نہ رہے۔ گھوڑا اڑانے میں پٹری نہ اکھڑے، گھوڑوں کے مزاج اور خو بو سے واقف ہو جائے، لگام دینی، زین باندھنا، قآزہ کرنا، اگاڑی پچھاڑی لگانی، کھریرا تھتی کرنی، ان چیزوں میں سائیس کا محتاج نہ رہے۔ جو بیماریاں گھوڑوں کو اکثر ہوتی رہتی ہیں ان کے علاج و معالجے سے خبردار ہو جائے۔ اسی طرح میرے استاد جن سے میں خط کی اصلاح لیتا تھا اماں جان کی یہ تاکید تھی کہ اس کو جس قدر ہو سکے نستعلیق لکھنا بتا دو۔ بس اتنا ہو جائے کہ کوئی اس کا لکھا دیکھ کر ناک نہ چڑھائے اور پڑھا اچھی طرح جائے۔ مجھے کچھ زیادہ خوشنویس بنانا نہیں ہے۔

خود زبیدہ جہاں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھاتی، وہاں
یے کو زبان، روزمرہ، محاورے کے نکات بھی بتاتی رہتی تھی۔
۔ یہ بات یاد رکھو کہ جب کوئی نیا لفظ کسی سے سنا کرو، ہم سے پوچھ لیا
۔ دو کہ یہ لفظ صحیح ہے یا غلط ہے۔ بعض غلطیاں تو ایسی ہیں جن کو جاہل
رباز اری لوگ ہی بولتے ہیں اور کوئی نہیں بولتا۔۔۔ سوان کا بولنا
ے عیب کی بات ہے۔ اور بعض غلطیاں ایسی ہیں جو پڑھے لکھے
راں پڑھو سب کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ جیسے تابعدار، بادشاہت
راد، چاکو، بگ بد، مرضق، شاباش، شالبتی، لاچار وغیرہ۔ سو ایسی
طیوں کا کچھ مضائقہ نہیں۔ اس کے سوا بہت سے اچھوتے لفظ
لیسے ہیں کہ عورتیں ہی بولتی ہیں، مرد نہیں بولتے۔ جیسے نوج، دوربار،
بائیں بھوئیں، اب سے چل دور، سدھارنا، موا، پچھل پائی، واری، اچھی،
ڑا، مرنے جوگا، بھیا، بھینا، نکھٹو، جان ہار، نپڈا، بوا، مردوا،
تا لبتا، نگوڑا، جھلسا، بھاڑ میں جائے، چولھے میں جائے، لگے لگو
رگور، نجتاوری، بودلی، وغیرہ، دیکھو کبھی کسی کے سامنے ایسے
ظ بول اٹھو۔ لوگ تمہیں تو کچھ نہیں کہنے کے، ہاں یہ کہیں گے کہ لڑکا
ں کی صحبت میں رہ کر بولی بھی عورتوں ہی کی بولنے لگا۔ غرض آدمی کو
ہیے کہ سب سے پہلے اپنی زبان کو درست کرے، پھر اور زبانیں سیکھنے
ارادہ کرے، نہیں تو وہی مثل ہوگی، کوا چلا ہنس کی چال اپنی
ہچال بھول گیا۔"

سید عباس کی خوش قسمتی سے بغداد کی رہنے والی ایک بڑی بی ان کو مل گئیں، زبیدہ نے حجت ان کو اپنے ہاں رکھ لیا۔

"وقت بے وقت جب مجھے اور کاموں سے فرصت ہوتی، ان سے گفتگو کرنے بیٹھ جاتا۔ اگرچہ میں نے عربی فارسی کچھ بہت نہیں پڑھی مگر ان کی صحبت میں مجھے یہ دونوں زبانیں بولنی ایسی آگئیں کہ جس طرح اپنی بولی میں میری زبان کہیں نہیں رکتی۔ یہی حال ان دونوں زبانوں میں ہے۔"

جب سید عباس نو برس کا ہو گیا تو ایک مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ مگر وہاں کی صحبت اچھی نہ تھی اس لئے سید عباس کی تربالنش پر ایک مدرسہ میں اس کا نام لکھوا دیا گیا، یہاں اس نے اردو فارسی، ریاضی کے علاوہ تاریخ و جغرافیہ بھی پڑھا اور انگریزی بھی سیکھی۔ افسوس ہے کہ سولہ برس کے سن میں اسے تعلیم ختم کر کے ہنر مل کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ ورنہ اس امتحان کا لڑکا نہ جانے کیا قیامت ڈھاتا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے قصہ بالکل سیدھا سادھا غیر دلچسپ ہے لیکن تعلیم و تربیت کا ایک نصاب ہے جو کہانی کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے اس نصاب میں بھی خامیاں ہیں، اس طرح کی تعلیم صرف امیرزادے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نصاب کا کسی سو طالب علموں پر مشتمل اسکول یا کالج میں چلانا بہت ہی مشکل ہے۔ البتہ یہ پوری کتاب دو بڑے اہم کام انجام دیتی ہے ایک تو یہ بحیثیت تاریخ کے پڑھی جا سکتی ہے یعنی اس سے شرفاء دلی کی معاشرت اور ان کی بچیوں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا نصاب

بہت اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے، دوسرے اس سے دلّی کی مستورات کی زبان ان کے محاورے، ان کی مثلیں انکی کہاوتیں انکا انداز گفتگو سیکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اردو ناول کی نشو ونما میں اس کتاب سے اگر کوئی فائدہ پہنچا ہوگا تو وہ صرف مکالمے تک محدود ہوگا ورنہ تو اس کے پلاٹ میں جان ہے اور نہ اس کے کردار اور سیرتوں میں سے کسی میں زندہ اور باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ ایک بات جو اور کھٹکتی ہے وہ اس میں جابجا انگریزی اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح خوانی ہے۔ بچیوں کے لئے بطور نمونہ اور مثال بار بار ملکہ وکٹوریہ ہی پیش ہوتی ہیں۔ کیا حالی کو اسلامی یا ہندوستانی خواتین میں کسی کی سیرت ایسی نہیں ملتی تھی جس کی تاسی کی وہ اپنی بچیوں کو تبلیغ کرتے؟ ممکن ہے کہ انگریز مربیوں کی خوشنودی کے خیال سے یہ حصے لکھے گئے ہوں تاکہ یہ کتاب نصاب میں ضرور داخل کر دی جائے اور زیادہ سے زیادہ پڑھی اور پڑھائی جائے۔ جو کچھ بھی اسباب ہوں غیر ملکی حاکموں کی منقبت نے کتاب کی قدر و قیمت کو آزاد ہندوستان میں بہت گھٹا دیا ہے۔

حالی اردو نثر کے اساطین میں سے ہیں لیکن قصہ گویوں اور ناول نویسوں کے دربار میں کرسی زرنگار کے مستحق نہیں۔ غالباً اس ایوان میں باقاعدہ داخلہ وہ اپنے لئے کچھ باعث افتخار بھی نہ سمجھتے۔ ان کا محبوب مقصد اصلاح قوم، اصلاح شاعری، اصلاح تعلیم و تربیت تھا، نہ کہ قصہ گوئی و داستان سرائی۔

وقار عظیم

حالی کی مجالس النساء

مولانا نذیر احمد نے قصہ نگاری اور بعض حیثیتوں سے ناول نگاری کی تاریخ میں فن کی ایسی روش کی بنا ڈالی جس نے اُن کی زندگی ہی میں ایک مسلم اور پسندیدہ روایت کی حیثیت حاصل ہوگئی، اور ان کے ہمعصروں نے ارادی طور پر اس کی تقلید و پیروی بھی کی اور غیر محسوس طور پر اس کے اثرات بھی قبول کئے۔ چنانچہ ان کے اپنے زمانے ہی میں بعض ایسے قصے لکھے گئے جو نذیر احمد کی روایت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حالی کی مجالس النسا اس روایت کی سب سے پہلی اور یقیناً بڑی دل کش صورت ہے۔

حالی نے یہ مجالس النسا، ۱۸۷۴ء میں مراۃ العروس کے تقریباً پانچ سال بعد اور بنات النعش کے قریب ڈھائی تین سال بعد لکھی۔ کتاب زیادہ ضخیم نہیں اور اس کا سارا مضمون اور مواد، اسی سائز کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سوا دو سو صفحوں میں سما سکتا ہے۔ کتاب کا یہ خوبصورت نام اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ حالی نے کتاب کو جن ابواب میں تقسیم کیا ہے

انھیں باب کی جگہ مجلس کہا ہے۔ کتاب میں کل نو باب یا مجلسیں ہیں اور ہر باب میں عورتوں کو ایسی باتیں بتانے اور سکھانے کی کوشش کی ہے جن سے عورتوں کو معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں ہر وقت سابقہ پڑتا ہے۔ مثال کے طور پہلی مجلس میں علم کی عام اہمیت کی وضاحت کے علاوہ یہ بتایا گیا ہے کہ عورتوں کی تعلیم معاشرتی اور قومی نقطۂ نظر سے کیوں اہم ہے اور اس سلسلے میں عورتوں کے کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔ دوسری مجلس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح باتوں باتوں میں اور کھیل کھیل میں بچوں کو اہم سے اہم اخلاقی سبق سکھائے جا سکتے ہیں تیسری مجلس توہم پرستی اور ہندی مسلمانوں کی ان بیشمار رسوم سے متعلق ہے جنھیں ہم نے بے سوچے سمجھے اور نتائج و عواقب پر نظر رکھے بغیر اختیار کر رکھا ہے۔ چوتھی مجلس سینے پرونے، پکانے رینڈھنے اور خانگی زندگی کے دوسرے مسائل سے متعلق ہے پانچویں مجلس میں اُن روابط و رسم کو موضوع بتایا گیا ہے جن کے بغیر انسان کی معاشرتی زندگی بامعنی نہیں بنتی۔ مجالس النساء کے دو حصوں میں سے پہلا حصہ اس مجلس پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں مسائل کا دائرہ صرف گھریلو زندگی یا عورتوں کی زندگی کے مسائل تک محدود نہیں رہتا۔ اس میں حالی نے ایسی باتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جو حقیقت میں سرسید کے نصب العین اور قومی اصلاح اور رفارم کے پروگرام کا اہم حصہ ہیں۔ مثلاً چھٹی مجلس میں جو پچھلی پانچ مجلسوں کے مقابلے میں طویل تر ہے انگریزی حکومت کی برکتوں کا بڑا مفصل ذکر ہے البتہ ان گوناگوں برکتوں کا رشتہ کسی نہ کسی طرح گھریلو زندگی سے بھی جوڑا گیا ہے

بتایا گیا ہے کہ انگریزوں کے پھیلائے علم کی روشنی نے ہمیں بری رسموں کے
اندھیرے سے نکال کر عقل و فہم کی راہ دکھائی ہے۔ اس کے بعد ہنرمندی
کی اہمیت جتا کر یہ بات دلنشیں کی گئی ہے کہ مستقبل میں ہماری فلاح و بہبود
تجارت اور صنعت پر ہے۔ سفر جسے لوگ اذیتوں اور صعوبتوں کی دُنیا کہتے تھے
اسے نئے حالات میں برکت کا سرمایہ بتایا گیا ہے۔ زبانیں سیکھنے کے سلسلے
میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ کئی کئی زبانیں سیکھنے کی سعی کرنا۔ مگر پہلے اپنی زبان
درست کرنا، پھر وہ زبان سیکھنا جس میں دین کی کتابیں ہوں، پھر بادشاہ وقت
کی زبان میں کمال حاصل کرنا۔ اس کے بعد جو زبان تھوڑی بہت آجائے
فائدے سے خالی نہیں" اس سلسلے میں حالی نے انگریزی میں کمال حاصل
کرنے پر اس لئے زور دیا ہے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے، اور فارسی صرف
اُسی قدر سیکھنے کی تلقین کی ہے جتنی اُردو کی رونق کے لئے ضروری ہو۔

مختصر یہ کہ مجالس النساء میں اس طرح کے اُن تمام مسائل کو چھیڑا
گیا ہے جس میں سے بعض نے غدر کے بعد مسلمانوں کی زندگی میں پہلے سے
زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی اور بعض ایک نئے قسم کے سیاسی اور معاشرتی
حالات میں پہلی مرتبہ اُبھر کر سامنے آئے تھے۔ اس طرح مجالس النساء سرسید
کے مشن اور ان کی قومی اور تعلیمی تحریک کی محابت میں تخلیق ہونے والے
ادب کی ایک کڑی بھی ہے اور اسی ماحول کی پیدا کی ہوئی اس فنی روایت
کا عکس بھی جو نذیر احمد نے قصہ گوئی کے لئے اختیار کی تھی۔

اگر ہم مجالس النساء کے موضوعات اور اُن کی ترتیب پر نظر ڈالیں تو

یہ اندازہ کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ حالیؔ کے فن کی بنیاد بھی وہی منطق ہے جو نذیر احمد کی بامقصد قصّہ گوئی کے فن کی پہلی منزل ہے۔ حالیؔ نے بھی مجالس النسا کے ابواب کا ڈھانچا بنانے سے پہلے وہی کیا ہے جو نذیر احمد لازماً کرتے ہیں یعنی انھوں نے غدر کے بعد کے مسلمانوں اور خصوصیت سے متوسط طبقے کے مسلمانوں کی زندگی پر ایک گہری نظر ڈال کر ایک طرف تو وہ چیزیں اخذ و جمع کیں جن سے بچوں، بڑوں، عورتوں، مردوں کو صبح و شام سابقہ پڑتا رہتا ہے یا جنھیں وہ اپنی روزانہ کی معمولی گھریلو زندگی کے علاوہ تقریبوں اور تیوہاروں میں برتتے اور رسم و رواج اور عقائد کا نام دیتے ہیں اور دوسری طرف ایسے مسائل کی فہرست مرتب کی ہے، جو ایک خاص عہد کے مخصوص تقاضوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت میں نذیر احمد کا انداز یہی ہے۔ لیکن اس حد تک نذیر احمد کی پیروی کرنے کے بعد حالیؔ نے اپنا راستہ آپ بنایا ہے۔ یہ راستہ بنانے اور اختیار کرتے ہوئے انھوں نے منطق سے صرف اسی حد تک تعلق رکھا ہے کہ اخذ و جمع کی ہوئی باتوں کو مختلف مجالس میں ترتیب وار یکجا کر دیا ہے اور یہ ترتیب قائم کرتے ہوئے معلم کی روایتی خشکی اور واعظ کی مثالی طوالتِ بیان سے کام لینے کے بجائے ایک ہمدرد اور درد مند ناصح کا وہ مسلک اختیار کیا ہے جس میں دلجوئی اور دلنشینی کو بہر حال مقدم سمجھا جاتا ہے اس ناصح مشفق کی نصیحت کی رفتار میں ایسی نرمی اور دھیما پن اور ہمواری و استواری ہے کہ ہر سننے والا اس کا ساتھ دے سکے اور بات اس طرح کہی جائے کہ

کہی ہوئی بات سیدھی دل میں جگہ کرے۔

مجالس النسا کی ہر مجلس کی ابتدا ایسے ہی دھیمے اور فطری انداز اور لہجے میں ہوتی ہے کہ سننے والا اس میں ایک یگانگت سی محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ بات کرنے والا میرا سچا ہمدرد اور مشفق ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے میری بھلائی کے لئے۔ حالی نے پڑھنے والوں سے جو بات کہی ہے وہ یوں ہی اچانک اور اندھا دھند نہیں کہہ دی اس کے لئے پہلے مناسب اور موزوں فضا پیدا کی ہے اور بات کو اس طرح آہستہ آہستہ اُبھارا ہے جیسے کلی پھول بن رہی ہے اور جوں جوں پھول بن رہی ہے اپنے حسن رنگین اور بوئے خوش سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رہی ہے۔ حالی نے باتیں تو سب نصیحت کی کہی ہیں اور گنتی میں وہ اتنی ہیں کہ ان کا گنانا بھی آسان نہیں لیکن ان نصیحتوں کو نہ ہی بوجھل ہونے دیا اور نہ کڑوا کسیلا۔ کڑوی کسیلی نصیحتوں میں ہر جگہ شہد کی حلاوت اور لذت ہے اور یہ حلاوت اور لذت ایک طرف تو حالی کی شخصیت کی حلاوت سے پیدا ہوئی اور دوسری طرف اس سے کہ ان تمام نصیحتوں کو یعنی حالی نے اپنی ہر بات بول چال کی آسان روز مرہ اور سلیس بامحاورہ زبان میں کہی ہے۔ اپنی دلیل کو موثر بنانے کے لئے سیدھی سادھی مثالیں استعمال کی ہیں۔ بات کے لئے طول طویل بیانیہ جملوں سے کام لینے کے بجائے گھریلو قسم کی بے تکلف بول چال سے کام چلایا ہے۔ اپنے مقصد کو سوال جواب کے ذریعے ابھار کر بے تکلفی کی مانوس فضا قائم کی ہے اور کہیں کسی جگہ نصیحت کو وعظ نہیں بننے دیا یہی دلیل اور منطق اُنھیں نذیر احمد کی پیروی سے آزاد کر کے ایک منفرد حیثیت دیتی ہے

ــــ شاید سوال پیدا ہو کہ کیسے؟ اس کے جواب میں "مجالس" کے بعض ماموں پر نظر ڈال لیجئے۔ شروع یا ہی مجلس سے بلکہ اس جگہ سے کیجئے جہاں پہلی نشست شروع ہوتی ہے۔

محمود بیگم: آپا جی آداب!

آپا جی: برخوردار! بڑھا سہاگن۔ بیگم! یہ تمہارے ساتھ اور کون ہیں؟

م: ہیں آپا جی! آپ نہیں جانتیں؟ میری بھتیجی ہیں

آ: اے کون ہیں؟ مریم زمانی؟

م۔ ز: حضرت! بندگی

آ: بھلا بیٹا! بہت سی کو میاں بیٹے، بچے جئیں۔ بوا! تم کہاں؟

م: جی میں ابھی آ کے اتری ہوں

آ: آؤ بیوی! بیٹھ جاؤ۔ کہو مزاج تو اچھا ہے؟

م ز: حضرت! خدا کا شکر ہے۔

آ: بچے اچھے ہیں؟

م۔ ز: سب آپ کو دعا کرتے ہیں

آ: مرزا! اس سے خط پتر آتا ہے۔

م۔ ز: جی ہاں! دسویں پندرھویں آتا رہتا ہے

آ: احمد مرزا کو مکتب میں بٹھا دیا؟

م۔ ز: جی مکتب میں بیٹھے تو اسے بہت دن ہو گئے

آ: لو! اللہ رکھو اب اس کی کیا عمر ہوگی؟

م۔ ز: جی اسے چاند دیکھے آن گنا برس لگے گا

آ: بھلا بوا! خدا کرے تمہاری کوکھ ٹھنڈی رہے۔ تمھیں اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھی نصیب ہوں۔ اب تو اللہ رکھو فارسی اُردو کے حروف خاصی طرح اٹھانے لگا ہوگا

م۔ ز: آتو جی! خدا خدا کرو۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ فارسی اُردو تو درکنار رہی ابھی تو اس نے قاعدہ بغدادی بھی ختم نہیں کیا۔

آ: بوا! کیا سبب؟

م۔ ز: حضرت آپ یا تیں میں لڑکا پڑھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے

آ: ہاں بی سچ کہتی ہو بیگم تم نے کیا کیا پڑھا ہے؟

م۔ ز: حضرت! کچھ پڑھا ہو تو بتاؤں

آ: ہے ہے لوگو! اشراف ' دلیوں نے کیسا پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ کیسی ان گھروں پر جہالت چھا گئی۔ کیسا الٹا زمانہ آگیا۔

گفتگو کو اس مرحلے تک پہنچانے کا مقصد اصل میں یہ ہے کہ حالی اس کتاب میں اپنے زمانے کے سب سے اہم مسئلے تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو الجھا کر انھیں اپنے پڑھنے والوں کے دل میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ انھیں اس بات کا پورا اندازہ اور احساس ہے کہ سیاسی حالات نے لوگوں کے دلوں کو معاشرتی زندگی کے کئی معاملات میں اور خصوصاً تعلیم کے سلسلے میں صدرجہ حساس بنا رکھا ہے اس لئے بات اس طرح کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کی نزاکت حس کو کبھی ٹھیس نہ لگے اور وہ بات کی اہمیت بھی محسوس کر لیں

چنانچہ انھوں نے اگلے ۱۹ - ۲۰ صفحوں میں اس موضوع کو بہت آہستہ آہستہ ابھارا اور نمایاں کیا ہے اور پہلے شریف گھرانوں کی تعلیم، مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور اس نظام کی اخلاقی اور تہذیبی اہمیت واضح کی ہے اور پھر اس کا رشتہ موجودہ حالات سے قائم کرکے اپنے دل کی بات کہی ہے اور اس طرح کہی ہے کہ وہ بات محض ان کے دل کی بات معلوم ہونے کے بجائے ہر سننے والے کے دل کی بات بن جائے۔ مسئلہ وہی ہے جو نذیر احمد نے مراۃ العروس اور بنات النعش میں پیش کیا ہے یعنی عورتوں کے پڑھنے پڑھانے کا مسئلہ لیکن نذیر احمد اور حالی کے انداز میں یہ فرق ہے کہ حالی سب باتیں مکالمے کے ذریعے سامنے لاتے ہیں اور باتیں کہتے وقت خود اپنی ذات کو قاری کے سامنے نہیں آنے دیا۔ نذیر احمد اس کے برخلاف قدم قدم پر سامنے آتے اور اپنی شخصیت کی عظمت سے اپنی دلیلوں کا وزن بڑھانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات منکسر المزاج اور درویش صفت حالی کے مزاج کے خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی دلیل کسی ایک جگہ بھی وعظ و پند نہیں بنتی۔ متفقانہ نصیحت البتہ وہ ہر جگہ ہے۔

نذیر احمد کے متعلق سب جانتے ہیں کہ مقصدیت، ان کی کہانیوں کا غالب جذبہ ہے اور اس جذبۂ غالب نے کبھی کبھی اتنی شدت اختیار کی ہے کہ نذیر احمد کی اُن فنی صلاحیتوں کے باوجود جو اُن میں فطرتاً موجود ہیں۔ (اور جن کا اظہار اُن کی واقعہ نگاری، سیرت نگاری اور مکالمہ بندی میں جابجا بڑے موثر انداز میں ہوتا ہے) اُن کا فن اُن کی مقصد پسندی کے ہاتھوں

مجروح و مذبوح ہوا ہے ـــــ یہاں تک کہ بعض کتابوں میں ہمیں ابواب کے آغاز و انجام میں وہ سیدھا سادھا اور معمولی اہتمام بھی نہیں ملتا جو قاری کو متوجہ کرنے یا اگلی بات کے لئے اشتیاق پیدا کرنے کے لئے بنیادی طور پر ضروری ہے۔ حالی کا دھیما اور نرم اور بامروت مزاج جس طرح زندگی میں ہر ایک کو اُس کا حق دینے کا قائل ہے اُسی طرح فن کے اصول کو بھی انکے بنیادی حق دینے کا اہتمام کرتا ہے۔ چنانچہ مجالس کے آغاز و انجام میں ہر جگہ ایک ایسا سادہ اور فطری انداز اختیار کیا گیا ہے کہ واقعات کی روانی بھی قائم رہے اور قاری کا ذہن بھی اس روانی اور تسلسل کا ساتھ دیتا اور نفسیاتی طور پر واقعات کی کڑیوں کے ساتھ اپنا ذہنی رشتہ قائم کرتا رہے پہلی مجلس جس طرح شروع ہوئی اُس کا فطری انداز آپ نے دیکھ لیا، اب ذرا اس مجلس کے آخری الفاظ بھی پڑھ لیجئے۔ آتوجی نے اپنی باتوں کا سلسلہ ختم کرتے کرتے زبیدہ خاتون، کا نام لیا اور ان کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہیں کہ سننے والوں کے دل میں اُن کا قصہ سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ باتیں ختم کر کے اُٹھنے لگیں تو محمودہ بیگم نے کہا "میں تو اب جبھی اٹھوں جب وہ قصہ سُن لوں گی" اس کے بعد جو باتیں ہوئیں وہ حالی کی زبانی سن لیجئے:

آتوجی: بیٹیا! تم بھی بڑی بیگم کے کہنے میں آ گئیں۔ واری، میں تم کو ایک چھوڑ دس قصے سنا دوں گی جاؤ، اب تو اُٹھ کے نماز پڑھو۔ عصر کا وقت تنگ ہوا جاتا ہے۔ مجھے بھی نماز پڑھنی ہے۔ خدا خیر رکھے تو کل کسی وقت سُننا

محمودہ بیگم: اِس وقت سُنا دو گی تو کیا ہو جائے گا؟

آتو جی: بیٹا! قصہ ہے یا کوئی منہ کا نوالہ ہے۔ تم تو اس وقت کہتی ہو، میرے نزدیک آٹھ دس دن میں بھی تمام ہو جائے تو غنیمت ہے

محمودہ بیگم: اچھا پھر کل کو کس وقت کہو گی؟

آتو جی: جس وقت تم کہو۔ پر میرے نزدیک رات کا وقت ہو تو بہتر ہے۔

محمودہ بیگم: بہت اچھا! دیکھو کہیں کل کو بھی اس طرح ٹال دو۔

آتو جی: بیٹا! آتو کو جھوٹا جانتی ہو۔ خاطر جمع رکھو۔ خدا نے چاہا تو کل ضرور کہوں گی جاؤ۔ اب تو تم نماز پڑھو۔ کہیں وقت نہ جاتا رہے۔

پہلی مجلس یہاں ختم ہوتی ہے اور بڑے فطری انداز میں ہوتی ہے لیکن جو بات اس فطری انداز سے بھی زیادہ دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حالی نے کہانی کے اس حصے میں کتاب کے باقی حصے یا آنیوالی آئندہ مجلس کا فنی جواز بھی پیدا کرلیا، اُن کے لئے ایک موزوں فضا بھی قائم کر لی، اور پڑھنے والے کے دل میں قصہ سننے کا شوق بھی پیدا کر دیا۔ لیکن ان سب باتوں میں اُس دھیمی رفتار کی وجہ سے اور اُس تدریجی اٹھان کی وجہ سے جو باب کے شروع سے آخر تک قائم ہے، آغاز کی طرح انجام یا خاتمے میں بھی تکلف اور آورد کا سایہ نہیں پڑا۔ سب مجلسوں کا انداز کم و بیش ایسا ہی ہے، یعنی آغاز سیدھا سادھا گھریلو، بے تکلفانہ اور زندگی کے رنگ میں ڈوبا اور رچا ہوا۔ انجام فطری اور منطقی۔ اور دونوں چیزیں مل کر تکلف اور آورد کے عیب سے پاک۔ آغاز اور انجام کے درمیان کے حصے سوچے سمجھے بھی اور زندگی کے صحیح مشاہدے پر مبنی بھی اس مشاہدے اور فکر میں اس میں شبہہ نہیں کہ مقصد کا عکس ہے

نصیحت کا پیرایہ ہے لیکن وعظ کا بوجھل پن نہیں۔ باتیں سادہ و بے تکلف بھی ہیں اور نرم و شیریں بھی۔ اور ان کی سادگی، بے تکلفی اور نرمی اور شیرینی میں روز مرّہ اور محاورے کے بے تکلف حرف اور تجربے اور مشاہدے کی ماہرانہ رنگ آمیزی نے برابر کا حصّہ لیا ہے اور پڑھنے والا اکثر یہ محسوس کرتا ہے کہ سادگی بھی کتنی رنگین اور کیسی پرکار ہو سکتی ہے۔ کچھ مثالیں اس کی بھی دیکھئے۔

حالی کو بات یہ کہنی ہے کہ بچے میں سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی استعداد فطرتاً موجود ہوتی ہے اُسے بس تھوڑے سے سہارے اور رہنمائی کی ضرورت ہے اور یہ سہارا اور یہ رہنمائی اُسے اپنی ماں سے حاصل ہو سکتی ہے اُسے حالی نے اپنے سادہ اور دل نشیں انداز میں اس طرح کہا ہے:

اُس کی مثال ایسی ہے جیسے چراغ میں تیل بتی سب کچھ موجود ہے فقط لوگ لگانے کی دیر ہے یا مکان کی نیو قائم ہو چکی ہے ہصرف دیوار اُٹھانی باقی ہے

ماں باپ کے غلط لاڈ پیار سے بچے کی عادت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی ہے اور لاڈ پیار کی وجہ سے بچے میں گستاخی کا جو انداز پیدا ہو جاتا ہے وہ جیتے جی نہیں جاتا ۔۔۔ اس بات کو مثال کے ذریعے یوں واضح کرتے ہیں:

"بچے کو پیار کرنا ایسا ہے جیسے کھیتی کو پانی دینا جس طرح پانی کی طغیانی کھیتی کو نقصان پہنچاتی ہے اسی طرح حد سے زیادہ پیار بچے کو خراب کرتا ہے"

عورتوں کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جو بات کریں مردوں کی پسند اور مرضی کے مطابق کریں۔ یہ اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے عورتیں

اگر اس بات کو اپنا معمول بنا لیں تو مرد ہمیشہ اُن کے گرویدہ رہیں۔ اس بات کو بھی ایک سادہ مثال کے ذریعے سمجھایا ہے: ١

"مرد کو ایسا سمجھو جیسے پیاسا اور عورت کو ایسا سمجھو جیسے چشمہ۔ اگر چشمے کے گرد درختوں کا سایہ بھی ہے اور چاروں طرف سبزہ بھی لہلہا رہا ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے تو پانی پی کر پیاسے کا جی بے اختیار یہ چاہے گا کہ دو چار گھڑی یہاں بیٹھ کر سبزے کی بھی سیر دیکھے اور جو نرا چشمہ ہی چشمہ ہے اور کچھ ایسی فضا کی جگہ نہیں ہے تو پانی پی کر اپنا راستہ لے گا" ٢

نصیحت کرنے سے زیادہ مشکل کام دنیا میں شاید کوئی نہیں۔ اس لئے کہ نصیحت کرنے والا اگر قدم قدم پر اس بات کا خیال نہ رکھے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ سننے والے کو ناگوار نہ ہو تو نصیحت ہرگز موثر نہیں ہوتی اس طرح کہنے والا بات تو اپنی کہہ رہا ہے لیکن اُسے کہنے کے لئے اُسے انداز دوسرے کے مزاج اور پسند کو دیکھ کر اختیار کرنا ہے، اور یہ ایک طرح کا ایثار ہے ـــ جو ناصح ایثار کی اس آزمائش سے گھبراتا ہے اُسکی نصیحت دل نشیں، اور اس لئے موثر اور کارگر نہیں ہوتی۔

حالی کی سادگی بیان اور اس سادگی بیان کے وہ گوناگوں پہلو جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ناصح کے منصب کے وہ گر اور وسیلے ہیں جو اس کی کڑوی کسیلی باتوں کی تلافی بھی کرتے ہیں اور قاری کو ناصح کا ہم خیال اور

ہم نوا بھی بناتے ہیں حالی نے بظاہر نذیر احمد کے منطقی اسلوب سے متاثر ہو کر مجالس النسا کے ذریعے نصیحت کی جو باتیں کہنے کا پروگرام بنایا ہے اُن کی فہرست بڑی طویل ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کبھی کبھی طوالت اختیار کیے بغیر چارہ نہیں اور جب طوالت اختیار کی جائے تو بات کا غیر دلچسپ، ناگوار اور بے مزہ ہو جانا یقینی ہے۔ چنانچہ مجالس النسا میں بہت سے مقام ایسے آتے ہیں جہاں بات اعتدال کی حد سے گزر کر واعظانہ طوالت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، لیکن ایسے موقعوں پر حالی عموماً وہ انداز اختیار کر لیتے ہیں جو واعظوں اور ناصحوں نے بھی قصہ گویوں سے سیکھا ہے ـــــ یعنی اپنی بات کو کسی چھوٹی موٹی کہانی کے ذریعہ زندگی کا رنگ دینا اور قاری کو اپنے تجربے میں برابر کا شریک کر لینا یہ کہانیاں بھی عموماً بڑی سیدھی سادھی ہوتی ہیں اور سیدھی سادھی عبارت میں بیان کی جاتی ہیں۔

ایک جگہ کہنا چاہتے ہیں کہ عادت بد بلا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بُری سے بُری عادت بھی انسان کے لئے راحت کا سرمایہ بن جاتی ہے اس جگہ ایک چھوٹی سی کہانی سنا دیتے ہیں آپ بھی سن لیجئے:

"ایک لڑکا چودہ پندرہ برس کی عمر کا، کسی قصور میں دس برس کو قید ہو گیا۔ جب قید بھگت چکا تو اُس کے چھوڑنے کے لئے حاکم کے سامنے لائے۔ اُس نے کہا اگر سرکار میری خاندکرے تو پھر مجھے جیل خانے ہی میں بھیج دے جس طرح پہلے مجھکو جیل خانے سے ڈر لگتا تھا۔

اسے وہاں سے نکلنا وبال معلوم ہوتا ہے۔ اگر سرکار نہ بھیجے گی تو
قید ہونے کے لئے پھر چوری کروں گا"

یہی بات ایک اور کہانی سنا کر اسے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی ہے اور اس مرتبہ کہانی کہنے میں خود وہ مزا لیا ہے کہ پڑھنے والے پر بھی لازماً وہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ کہانی بھی خود حالیؔ کی زبان سے سُن لیجئے:

گرمی بہت سخت پڑ رہی تھی۔ ایک دن چلتے چلتے راہ میں دوپہر ہوگئی۔ ایک درخت کے سائے میں ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر میں اُدھر سے ایک پینس آئی۔ آٹھ کہار، ایک بھشتی، دو خدمتگار ساتھ۔ پینس کے دونوں طرف خس کے پردے چھٹے ہوئے۔ بھشتی برابر پانی چھڑکتا چلا آتا ہے۔ سامنے کچھ اور درخت سایہ دار تھے پینس وہاں آن کر ٹھہری۔ برابر کنواں اور حلوائی کی دوکان تھی۔ کہاروں نے پینس کو تو وہاں رکھا اور آپ کنویں پر جا کر منہ ہاتھ دھویا اور حلوائی کی دوکان سے پوریاں لے کر دھوپ ہی میں کھانے بیٹھ گئے۔ کھا پی کر ڈفلی بجائی اور گانا شروع کیا۔ اِدھر جوان کو دیکھتا ہوں تو پینس میں پڑے ہائے واے کے نعرے مار رہے ہیں اور بار بار بھشتی سے پانی چھڑکوا رہے ہیں۔ میں نے اُن کے خدمتگاروں سے پوچھا کہ کیا یہ بیمار ہیں؟ اُنھوں نے کہا 'صاحب! بیمار تو کچھ نہیں۔ گرمی کے مارے گھبرا رہے ہیں' میں نے اپنے دل میں کہا 'سبحان اللہ! کیا خدا کی شان ہے!'"

ایک کہانی اور سن لیجئے، پھر آگے چلیں:

"ایک بھلے مانس کا لڑکا کہیں بیاہنے چڑھتا تھا۔ اس نے دو چار گھڑی کو اپنے کسی دوست کا دوشالہ مانگ لیا۔ جب بیٹی والوں کے یہاں جاکر برات اتری، ایک آدمی نے پوچھا "کیوں صاحب! دولھا کون سے ہیں؟ جس سے دولھا نے دوشالہ مانگا تھا، کہیں وہ بھی وہیں کھڑا تھا۔ کہا حضرت! دولھا تو وہ بیٹھے ہیں، پر دوشالہ مانگے کا ہے۔ دولھا بے چارہ یہ بات سن کر پانی پانی ہوگیا اور دوشالہ اتار کر اس کے حوالے کیا۔ اس نے کہا "بھئی! اس کے تو مجھ سے قصور ہوگیا۔ خیر اسے تو معاف کیجئے، پر اب ایسا نہیں ہونے کا"، اور دوشالہ پھر دولھا کو دے دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک اور شخص اسی طرح پوچھتا ہوا چلا آیا۔ اس نے کہا "صاحب! دولھا یہ بیٹھے ہیں اور دوشالہ بھی انھیں کا ہے"۔ دولھا نے دوشالہ اتار کر پھینک دیا اور کہا "ایسے اوچھے کے احسان سے خدا بچائے"۔ اس نے پھر بہت معذرت کرکے دوشالہ دے دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک تیسرا اور پوچھتا چلا آیا۔ اس نے جلدی سے دوڑ کر کہا، حضرت! دولھا تو یہ ہیں اور دوشالے کا کچھ ذکر نہیں"

یہ تینوں چھوٹی چھوٹی حکایتیں حالی نے کسی نہ کسی اخلاقی قدر کی وضاحت اور صراحت کے لئے استعمال کی ہیں۔ کہانیاں اسی سادہ سلیس روزمرہ میں بیان

وئی ہیں جو حالی کا اسلوب خاص ہے تنقید اور سوانح نگاری کہ وہ دونوں بیان کے کھر رکھاؤ اور متانت کے زیادہ طالب ہیں حالی نے اظہار وابلاغ کیلئے محاورں کی حرف لی ضرورت نہیں سمجھی لیکن نصیحت آمیز کہانیوں میں انکے بے تکلف استعمال سے لطف و حسن پیدا ہوتا ہے چنانچہ انہیں جابجا ایسے محاورے ملتے ہیں جن سے کلام کی تزئین بھی ہوتی ہے اور تاثیر بھی بڑھتی ہے اسکے باوجود آورد کی وہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی جس سے کہیں کہیں نذیر احمد جیسے جید نثر نگار کی عبارتیں بھی گراں بار نظر آتی ہیں۔ان ملی جلی چیزوں نے ان چھوٹے چھوٹے چٹکلوں یا حکایتوں میں ہر جگہ کہانی کا سماں پیدا کر دیا ہے اور یہی اچھی کہانی کی بڑی خوبی ہے۔کہانی میں مجموعی حیثیت سے یہ سماں اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب کہانی کہنے والے کو یہ اندازہ نہ ہو کہ کہانی کس طرح شروع ہو اور کس طرح ختم اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ٹھیک کس جگہ ختم ہو جائے۔کہانی جب اپنا مقصد پورا کر چکے اور اُس سے وہ تاثر پیدا ہو جائے جو قصہ گو کا مقصود ہے تو پھر دس قدم بھی آگے نہیں بڑھنا چاہیے حالی کی ان تین حکایتوں میں یہ خوبی بھی موجود ہے۔اور یہ خوبی مجالس النساء کے آخر میں خصوصیت سے نمایاں ہوتی ہے۔

کتاب کے آخر میں حالی نے یہ بتانے کے لیے سفر انسان کا سب سے بڑا معلم ہے ۲۳، ۲۴ صفحے کا ایک طویل قصہ بیان کیا ہے۔اس قصے میں واقعات کا انداز اور ان واقعات میں سے گزرنے والے افراد کا رنگ اتنا فطری ہے کہ اُن میں سے کوئی فرضی یا نقلی نہیں معلوم ہوتا، یہاں تک کہ حالی کے بلند معیار حیات نے بھی دونوں میں سے ایک چیز کو بھی مثالی یا رومانی نہیں بننے دیا

سیدھی سادھی زندگی، سیدھے سادھے کردار اور اُن کی سیدھی سادھی باتیں جن سے کہانی دلچسپ بھی بنتی ہے اور موثر اور دل نشین بھی اور جب وہ ختم ہو چکی ہے تو بڑے چپکے سے پڑھنے والوں کے دل میں گھر کر کے رخصت ہو جاتی ہے۔ اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بات اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ حالی نے قصے کو وہیں ختم کر دیا ہے جہاں اُسے ختم ہو جانا چاہیئے (درآں حالیکہ نذیر احمد کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ انھیں جیسے قصے کو قصے کی طرح ختم کر کے پچھتاوا سا ہوتا ہے اور وہ قصہ ختم کر چکنے کے بعد نصیحتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں)

ایک مقصدی اور سبق آموز قصے کی حیثیت سے اگر مجالس النساء پر مجموعی انداز میں تبصرہ کیا جائے تو ساری بات کا خلاصہ یہ ہو گا کہ یہاں قصے اور مقصد دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے، دونوں کی سطح برابر رکھی گئی ہے، دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر غالب اور حاوی ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔ قصے کا انجام بھی بخیر ہوا، جیسا کہ مقصدی اور اصلاحی قصوں کیلئے ضروری سا ہے اور اس انجام میں قصے کے مختلف اجزا یعنی واقعات اور کردار مختلف مراحل سے گزر کر اس جگہ پہنچ گئے جو ان کی منزل مقصود معلوم ہوتی ہے۔

مجالس النساء کوئی پیچیدہ اور بلند پایہ فنی کہانی نہیں۔ وہ ایک سیدھی سادھی اصلاحی کہانی ہے، اور لکھنے والے نے اپنے مقصد کے اظہار میں کسی جگہ بھی اس جوش سے کام نہیں لیا، جو اعتدال اور توازن کا دشمن ہے۔ اسی لئے اس کی فضا غیر فطری نہیں اور اس کے کرداروں کے نقش و نگار مبالغہ آمیز نہیں۔ دونوں پر کہیں دور دور بھی جھوٹ کا سایہ نہیں پڑا۔ انکی اپنے اصلی

روپ میں سامنے آئی ہے۔ اُسے اپنے حسن کے نکھار کے لئے بدی کا سہارا ڈھونڈنے اور اپنے نور کو چمکانے کے لئے ظلمت کا پس منظر بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ حالیؔ کو دوسرے قصہ گویوں کی طرح نیکی کی یہ تحقیر گوارا نہیں۔ حالیؔ کے فن میں یا مجالس النساء کے فن میں جس طرح نیکی کا بول بالا ہے اسی طرح فن کی سادگی، خلوص اور معصومیت کا سر بھی اونچا ہے اس لئے کہ یہ مصنف کی سادگی، خلوص اور معصومیت کا عکس ہے۔ فن کار کی زندگی پر تکلف اور تصنع کی چھاؤں نہیں پڑی، اس کا فن بھی اس کا زیر بار احسان نہیں ہوا۔ اور مجالس النساء کی مقصدیت اور افسانویت کی کامیابی کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔

حکیم عبدالقوی دریاآبادی (بی اے)

مولانا حالی کی یادگار زمانہ تصنیف

اردو کے عناصر خمسہ (سرسید، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی) میں مولانا الطاف حسین حالی ہی ایسے تھے جو نظم ونثر دونوں اصناف میں یکساں طور پر مشہور ہوئے۔ جس طرح نظم میں ان کے مسدس، مناجات بیوہ، مرثیہ غالب وغیرہ سے کسی حال میں قطع نظر نہیں کی جاسکتی، اسی طرح نثر میں ان کے مقدمہ شعروشاعری، حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نثر کی صنف سوانح نگاری میں مولانا حالی ہی نے نئی راہ کھولی۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی تینوں سوانح عمریاں — حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ اور ان تینوں میں درجۂ اختصاص یادگار غالب کو حاصل ہے اور اسے صحیح معنی میں ان کی یادگار زمانہ تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ مرزا غالب حالی کے اُستاد تھے، اور حالی ان کا انتہائی احترا

کرتے تھے۔ ایسے سعادت مند شاگرد بہت ہی کم استادوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے استاد کی عظمت و شہرت میں ایسا اضافہ ہو جیسا کہ مولانا حالی کی اس تصنیف کی بدولت غالب کی عظمت و شہرت میں ہوا۔
غالب پر اب تک بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ سوانح عمریاں بھی، اور کلام کی شرح اور اس پر تبصرہ بھی۔ اور ان میں سے بعض کتابیں خاصی ضخیم بھی ہیں اور بعض میں ریسرچ کو انتہائی موشگافیاں بھی کی گئی ہیں۔ لیکن حالی کی یادگارِ غالب کو نہ صرف تقدم زمانی کی فضیلت ہے بلکہ اس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی جس قدرت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس کی مثال غالبیات کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ اور غالب پر بعد میں جس نے بھی قلم اٹھایا اُسے بہر حال یادگارِ غالب ہی کو پیش نظر رکھنا اور اپنے سارے ماخذوں میں سب سے زیادہ موثق و مستند سمجھنا پڑا ہے۔ اس کے مختصر اشارات کو لیکر لوگوں نے صفحوں کے صفحے لکھ ڈالے ہیں۔ اور اس کے بیانات پر ریسرچ کر کے دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں۔ اس مضمون میں اس یادگارِ زمانہ کتاب کی خصوصیات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے گی۔
کتاب کے ٹائٹیل (سرورق) پر ذیل کی عبارت درج ملتی ہے: "مرزا اسد اللہ خاں غالب کے حالات زندگی اور ان کے اقسام نظم و نثر اردو و فارسی پر ریویو اور انتخاب۔ کتاب کے آغاز میں چند صفحوں کا ایک دیباچہ ہے اس میں وہ اس سوانح کی غرض تالیف بیان کرنے کے ضمن میں رقمطراز ہیں۔
"اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری

اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اس ایک کام
نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان
واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر
فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا
کچھ کم احسان نہیں ہے، اس لئے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا
خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ
معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور ان کی شاعری و انشاء
پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطہ بیان میں آسکیں اور
ابنائے زماں کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقہ کے
موافق قلم بند کروں۔۔ ۔ اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے
شاعری کو اس عجیب و غریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے
جو خدائے تعالےٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور
جو کبھی نظم و نثر کے پیرائے میں کبھی ظرافت و بذلہ سنجی کے روپ
میں کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف
و حب اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا پس جو ذکر ان
چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع
سے خارج سمجھنا چاہیئے۔"

آگے چلکر مولانا حالی نے یہ بھی تحریر کیا ہے

"مرزا کو بحیثیت شاعر، پبلک سے روشناس کرانے اور ان کی

شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا
کہ ان کے اصناف کلام میں سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا
ہر صنف میں جو باتیں مرزا کے خصوصیات سے ہیں وہ بیان
کی جاتیں۔ جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی و معنوی خوبیاں
نزاکتیں اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں۔ شعرا کے جس طبقہ میں
مرزا کو جگہ دی جانی چاہیے اس طبقہ کے شاعروں کے کلام سے
مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، ان کی غزل سے مرزا کی غزل
کو قصیدہ سے قصیدہ کو اور اس طرح ہر صنف سے اس صنف
کو ٹکرایا جاتا اور اس طرح مرزا کے پایہ شاعروں اور ان کے کلام
کی حقیقت سے اہل وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر
مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اس قدر پبلک کے لئے
خاص کر اس زمانہ میں غیر مفید بھی تھا۔"

واقعی اس زمانے میں اس طرح کی کتاب لکھنا سخت دشوار تھا۔ لیکن اب غالب پر مولانا حالی کے اس خاکہ کے مطابق نہ معلوم کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان میں سے بعض بعض میں غلو و بے اعتدالی کی بھی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ کاش مولانا حالی ہی کے متین و متوازی قلم سے اس طرز کی کتاب لکھی ہوتی۔

یہ کتاب متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور غالب کی سوانح اور اس کے متعلقات پر ایک درجن سے زائد محققانہ و مبسوط کتب کی اشاعت کے بعد

بی اس کی مقبولیت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔ حصہ اول جو مرزا کی سوانح پر مشتمل ہے، اس میں انتہائی اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے، لیکن روایات کا استناد خاص طور سے قابل ذکر ہے اور سوانح کا بہت بڑا حصہ تو خود مرزا غالب ہی کے خطوط اور کلام (خصوصاً فارسی کلام) سے ماخوذ ہے، اس لئے کہ سوانح کا یہ حصہ ایک حد تک خود نوشت سوانح کے حکم میں جاتا ہے۔ خود مرزا غالب اس زمانہ کی عام روش کو خیرباد کہہ کر اگر اپنی سوانح اپنے قلم سے لکھتے تو وہ شاید مولانا حالی کی اس مرتبہ سوانح سے زیادہ مختلف نہ ہوتی۔

غالب نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا سفر جو کیا وہ دہلی سے کلکتہ کا تھا۔ کلکتہ کے دوران قیام میں حامیان قتیل سے غالب کے مباحثہ نے بالآخر مجادلہ و مکابرہ کی شکل اختیار کر لی اس کے ذکر کے سلسلے میں حالی نے ان کی فارسی مثنوی "باد مخالف" کے اشعار مختلف مقامات سے پیش کر کے غالب کی وکالت خود غالب کی زبانی انجام دی ہے۔ اس طرح جب دہلی میں کوتوال کی دشمنی کے باعث وہ چند ماہ جیل خانے بھیج دیئے گئے تھے، اس کے صحیح واقعات اور اس سے جو اثرات مرزا غالب کی حساس طبیعت نے قبول کئے تھے وہ مرزا غالب ہی کے ایک فارسی خط اور ان کے ایک فارسی ترکیب بند (جو انہوں نے اپنے مجموعہ کلیات فارسی میں شامل نہیں ہونے دیا تھا) کے حوالوں سے لکھے ہیں۔ جس سے یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ چند سال قبل ہندوستان میں جو فلم مرزا غالب کے نام سے تیار کیا گیا تھا اس میں

ان کی زندگی خصوصاً ان کے واقعۂ قید کو کتنی غلط اور مسخ شدہ شکل میں پیش کیا گیا تھا اس سلسلے میں مولانا حالی کی ذیل کی عبارت پڑھ لی جائے۔

"یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُن کو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی، وہ بالکل قید خانے میں ایسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے، کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دلخواہ ان کو گھر سے پہونچتی تھیں ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف نظر بندوں کے جیل خانہ کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفاء والیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ اس کو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے چنانچہ جو ترکیب بند انھوں نے قید خانہ میں لکھا تھا، اس میں کہتے ہیں

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست
بہر آزار غم از قید فرنگم نہ بود
جور اعدا ردوا از دل بہ رہائی لیکن
طعن احباب کم از زخم خدنگم نہ بود"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جسے غدر کے نام سے عرصہ تک موسوم کیا جاتا رہا تھا اور اب اسے جنگ آزادی کا لقب حاصل ہے مرزا غالب دہلی میں رہے

ان پر اس ہنگامہ میں جو کچھ گزری اس کا ذکر چند ہی صفحوں میں ہے، لیکن ہے بڑا ہی مؤثر۔

مرزا غالب کی زندگی میں ایک اور اہم ادبی معرکہ ہوا تھا، انھوں نے فارسی کی مشہور اور ضخیم لغت برہان قاطع پر اعتراضات کئے تھے جو بعد میں قاطع برہان اور درفش کاویانی کے ناموں سے کتابی صورت میں شائع ہوئے برہان قاطع کے حامیوں اور پرستاروں نے اس کے متعدد جوابات لکھ ڈالے حالی نے اس معرکہ کا حال اس کتاب کی عام روش اختصار کے خلاف بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور اگرچہ اس بحث میں انھوں نے مرزا ہی کو حق بجانب ٹھہرایا ہے تاہم انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور چند مقامات پر خود مرزا کی لغزش کا بھی اعتراف کھل کر کیا ہے۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات کا باب اس حصہ میں خاص طور سے لائق مطالعہ ہے۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ کرتے چلئے۔

"جیسی مرزا کی طبیعت میں ذکاء اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت ہی قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے، مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر آجاتی تھی، ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے

جن کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں؟"
مرزا کی خوش طبعی اور بذلہ سنجی کے اظہار کے لئے حالی نے ان کے بہت سے لطائف درج کئے ہیں، جن میں آمد ہی آمد ہے، آورد کا نام نہیں۔ اس کے بعد مرزا کے مذہبی معتقدات کی وضاحت کی ہے اور اس میں کسی قسم کے اخفا و تستر سے کام نہیں لیا ہے اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مرزا باوجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانوں کی نہیں ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے؟ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی، جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر ان سے کہے بغیر نہیں رہا جاتا تھا، خواہ اس میں ان کو کوئی کافر سمجھے یا رند مشرب کہے یا بد مذہب جانے۔"

حالی کے قلم نے اپنا اصل کمال یادگار غالب کے حصہ دوم میں دکھایا ہے جس کے جزو اول میں مرزا کے اردو کلام پر ریویو لیا اور اس کا انتخاب ہے اور جزو ثانی میں ان کے فارسی کلام اور فارسی نثر پر بہترین قابل قدر تبصرہ کیا ہے اس سلسلہ میں حالی نے تمہید ہی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ:-

"مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گرانقدر ہے وہ

ان کی فارسی نظم و نثر ہے لیکن اول تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں پس جو شخص اس زمانہ میں ان کے کلام میں ریویو کرتا اور اس کے ذریعہ سے مصنف کی حقیقت اور اس کا مرتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جس میں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہو سکتی ہے"

جہاں تک اُردو کلام کا تعلق ہے حالی کی کوشش اندازہ سے زیادہ کامیاب رہی اور آج غالب اور ان کے اردو کلام پر دفاتر کے دفاتر تیار ہو چکے ہیں ۱۱ البتہ ان کا فارسی کلام (جس کے مقابلہ میں مرزا اپنے اردو کلام کو محض ہیچ اور بے رنگ سمجھتے تھے) حالی کے تبصرہ و تعارف کے بعد بھی زیادہ روشناس نہ ہو سکا اور اس کی داد مرزا کو جتنی ملی تھی وہ ان کی زندگی ہی میں ملکر رہی کہ اس زمانہ میں فارسی نثر و نظم کے قدرداں و قدرسنج خاصی تعداد میں موجود تھے۔

مرزا غالب اردو میں ابتدا میں جو طرز سخن اختیار کیا اس کے بارے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:-

"مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا۔ جیسا کہ وہ

خود فرماتے ہیں ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے "

اس کے بعد حالی نے ان کے وہ سات ابیات پیش کئے ہیں جو اس طرز میں تھے، اور جنھیں مرزا نے اپنے اردو دیوان میں جو عام طور سے متداول ہے شامل نہیں کئے لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک۔

"اب بھی اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سی اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے"

بطور نمونہ پانچ شعر پیش کئے ہیں مثلاً۔۔ ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا

تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یک قدم وحشت سے درس دفترِ امکاں کھلا

جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا"

اور ان اشعار پر اپنی جچی تلی رائے ظاہر کی

" ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی سے اور جگر کاوی سے سرانجام کئے ہوں گے، جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے

کیوں نہ دکھا ہو گا۔ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت
بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے ان
کے کاٹنے پر مرزا کا قلم اٹھ نہ سکا۔"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے یادگار غالب کو کتاب لب سب نہیں بنایا۔ دھیان کہ ان کی دوسری مرتب کردہ سوانح عمری حیات جاوید کو ان کے بعض ہمعصر نقادوں نے قرار دیا تھا، بلکہ ان کے کلام میں ان اجزاء کو سراہنے کے بجائے ان کی صرف توجیہ پر اکتفا کی ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی، وہ
کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی، لوگ عموماً
میر، سودا، میر حسن، جرأت، انشا وغیرہ کا سیدھا سادھا
اور صاف کلام سننے کے عادی تھے، شعر کی بڑی خوبی یہ
سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا ادھر سامع
کے دل میں اتر گیا مگر مرزا کے ابتدائی ریختہ میں یہ بات بالکل
نہ تھی جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی
اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا
جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان
خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ ان سے پہلے
اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں مثلاً ان کے موجودہ

اردو دیوان میں ایک شعر ہے ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس شعر کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اے کی جگہ
جز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آجائیں گے... یہاں جس معنی میں
مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انھیں کا
اختراع ہے... مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تابقدر بچتے
تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اس لئے وہ بہ نسبت
اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے
کہ طرز بیان اور طرز خیال میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔"

اس کے بعد حالی نے لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ مرزا کو اپنی بے راہ روی کا احساس
ہوا اور ۔

"استقامت طبع اور سلامت ذہنی نے ان کو راہ راست پر
ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔"

اور اس کے بعد انھوں نے جو کمال حاصل کیا اسے چند سطروں میں مولانا
حالی نے نہایت خوبی سے بیان کر دیا ہے۔

"مرزا کے اردو کلام میں غزل کے سوا اور کوئی صنف
شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بہ مقابلہ
بعض شعراء کے تعداد میں کتنی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر

منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ
تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخاب اشعار سے
کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ
میں نکلیں گے اسقدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے مرزا کے اس کے بعد کے کلام کی خصوصیات امتیازی دکھائی ہیں اور ہر ایک کے نمونے پیش کئے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین
کے کلام میں ایک ہی قسم کے جذبات اور مضامین دیکھتے دیکھتے
جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پہ نظر ڈالتے
ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے۔"

اس کے بعد چند اشعار، ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت کرنے کی غرض سے بہ مختصر تشریح کے پیش کئے ہیں اور حاشیہ پہ ہر شعر کا موضوع بھی متعین کر دیا ہے۔ مثلاً اخلاق کے موضوع پر یہ شعر نقل کیا ہے ؎

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور اس شعر کی تشریح یوں کی ہے:۔

"بادی النظر میں ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے
دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ
دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل
یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے
یہ منطقی استدلال نہیں بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔"

ادارۂ فروغِ اردو

کی

مطبوعات

جن کے بغیر

آپ کی لائبریری نامکمل ہے

آل احمد سرور

نئے اور پرانے چراغ

(مع اضافہ جدیدہ)

سرور صاحب کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف جو اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے اس طبع ثانی اور بعض نئے مضامین کے بعد ہم نے بہات اہتمام سے شائع کی ہے جس میں اس قسم کے اہم مضامین آپ کے ذوق ادب کی تعمیر میں مدد دیں گے۔

نیا ادبی شعور، ریاض اور ہم، روح اقبال، اکبر اور سرسید، رشید احمد کی شخصیت وغیرہ صفحات ۴۰۸ کاغذ گلیز، طباعت دیدہ زیب مجلد مع دلکش سرورق۔ قیمت پانچ روپے

آل احمد سرور

تنقیدی اشارے

(مع اضافہ جدیدہ)

یہ مشہور کتاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے اب سرور صاحب نے اس پر نظر ثانی کر کے چند اہم مضامین کا اضافہ کیا ہے نہایت عمدہ طباعت خوبصورت گرد پوش قیمت مجلد تین روپے

ذوقِ جنوں

سرور صاحب بہ حیثیت شاعر بھی محتاج تعارف نہیں، اُن کے کلام میں شگفتگی اور روانی ہے فلسفہ حیات کی گہرائیاں ہیں، حقیقی ترقی پسندی کی جھلکی ہے ساتھ ہی شیرینی اور لطافت ہے۔ ان کا یہ مجموعہ کلام معنوی خوبیوں کے علاوہ ظاہری محاسن سے بھی آراستہ ہے اعلیٰ طباعت سائز مجلد خوشنما گرد پوش قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

احتشام حسین

ذوق ادب اور شعور

تنقیدی و تحقیقی مضامین کا گلدستہ جن میں سولہ عنوانات پر مصنف موصوف نے اپنے افکار و تحقیقات کا عکس پیش کیا ہے چند عنوانات ملاحظہ کیجئے۔

مشاعرہ کی افادیت، زبان اور رسم الخط، ادب کا مادی تصور، میں کیوں لکھتا ہوں، زبان اور رسم خط وغیرہ صفحات ۲۵۶ طباعت و کاغذ اعلیٰ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت ڈھائی روپے

ساحل اور سمندر

احتشام صاحب تین سال ہوئے امریکہ کے ایک تحقیقی ادارہ کی دعوت پر امریکہ گئے اور ایک سال قیام کیا، ساحل اور سمندر ان کا سفرنامہ ہے جس میں نئی دنیا کے حالات، علمی ادبی تحریکات اور دیگر ہنگامی واقعات و حالات اپنے خاص انداز میں لکھے ہیں اس طرح یہ ادبی تحفہ بھی ہے اور تاریخی، جغرافی اور علمی معلومات کی حیثیت سے ڈائری بھی۔ طرز تحریر میں ان کی تنقیدی خشکی پر تازگی و شگفتگی غالب آگئی ہے۔ طباعت کتابت دیدہ زیب سرورق خوبصورت صفحات قیمت مجلد روپے آٹھ آنے

روایت وبغاوت (مع اضافہ جدید ایڈیشن)

احتشام صاحب کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اب جدید مضامین کے اضافہ کے ساتھ ادارہ نے اس کو شائع کیا ہے

اس میں متعدد مضامین تنقیدی ہیں۔

صفحات تقریباً ۱۵۰ طباعت اور کاغذ اعلیٰ مجلد خوبصورت گرد پوش قیمت تین روپے

مکمل ترین شرح

"شرح دیوان غالب"

از۔ ناقد خبیر اختر علی تلہری وادیب شہیر علی عباس حسینی ' ارد و اشعار غالب کی عالمانہ شرح۔

(زیر طبع)

امین آباد

طرزی صاحب دو سو سے زیادہ ناول لکھ چکے ہیں لیکن امین آباد اس کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ شاہان اودھ کی راجدھانی لکھنؤ کے سب سے بڑے حسین وجمیل بازار امین آباد، کی دلکش فضاؤں میں پروان چڑھنے والی ایک ماں کی داستان کو لکھنؤ کے روایاتی پس منظر کے زیر سایہ پیش کیا ہے۔ یہ لکھنؤ کی جدید وقدیم تہذیب معاشرت کا حسین امتزاجی مرقع بھی ہے اور ہمارے سماج میں گھن لگانے والے عیوب کی پردہ دری بھی ہے۔ اس میں شام اودھ کی رنگینیاں ساری دل آویزیوں کے ساتھ نظر آئیں گی لکھنؤ کی خستہ ورفتہ ٹکسالی زبان، بیگماتی محاورات، روایاتی تکلفات و تصنع کی جھلکیاں دیکھنا ہو تو طرزی صاحب کے اس بے مثل شاہکار کو دیکھئے۔ جو ان کے دو سو سے زیادہ ناولوں میں ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔ اعلیٰ کتابت وطباعت، صفحات ۳۰۰ خوبصورت رنگین گرد پوش قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے

تنقیدی نظریات

اصول اور فن تنقید کے متعلق مضامین کا مجموعہ سید احتشام حسین صاحب نے مرتب فرما کر وہ ادبی خدمت انجام دی ہے جو ہمیشہ دنیا تک یادگار رہے گی۔ اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل تنقید نگاروں کے مضامین شامل ہیں جو اصول وفن تنقید کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اصول اور فن تنقید کو سمجھنے کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر کلیم الدین احمد ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، اسلوب احمد انصاری، سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر عبد العلیم پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر اختر اورینوی، ریاض احمد، سید ممتاز حسین قیمت صرف چار روپے

اردو کی کہانی
احتشام حسین

اردو زبان کی تاریخ اور مختصر عہد بہ عہد ترقی کا حال طلبا کے لئے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں تمام شعرا کی تصاویر۔ اعلیٰ طباعت نہایت خوبصورت سرورق قیمت ایک روپیہ

سلک گہر برائے بی۔ اے آگرہ یونیورسٹی تین روپے

انتخاب نثر جدید برائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دو روپیہ آٹھ آنے

ادب پارے نثر و نظم برائے انٹرمیڈیٹ یوپی و صوبہ بہار چار روپیہ بارہ آنے۔

بہادر شاہ ظفر
منشی امیر احمد علوی

آخری تاجدار سلطنت مغلیہ ابو المظفر حضرت بہادر شاہ ظفر کے مستند حالات زندگی ۱۸۵۷ء کی تحریک جنگ آزادی کے دلچسپ و عبرت ناک واقعات انتزاع سلطنت، جلا وطنی، رنگون میں نظر بندی کا مفصل حال شاہ ظفر کے علمی ادبی ذوق کی کیفیت، آخر میں کلیات ظفر کا ایک جامع انتخاب بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اس دور میں بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ بہادر شاہ پر اردو میں اس سے زیادہ معتبر و مستند کوئی کتاب نہیں ہے۔ اعلیٰ طباعت حسین و دلکش سرورق ۲۸۸ صفحات۔ چوتھا اڈیشن قیمت تین روپے

اچھی نظمیں
ملک مشتاق

دس بچوں کے لئے مختلف و دلکش عنوانات پر آسان اور دلچسپ نظمیں بچوں کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر بہت سادہ و سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں، نہایت عمدہ طباعت خوبصورت ٹائیٹل۔

قیمت پانچ آنے

اردو شاعری
امیر احمد علوی

دوسری قوموں کی دماغی غلامی نے ہمارے نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے اشخاص بھی پیدا کر دیئے ہیں جو اردو زبان کی شان پر غیر شائستہ ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے نے اس کتاب میں اُن کے خیالات کی تردید فرمائی ہے اور شعرائے قدیم کا وہ کلام پیش کیا ہے جس میں بد وضعی اور آوارگی کے پہلو نکلتے ہیں، آپ نے اس مضمون میں اردو شاعری کے وہ اشعار بھی جمع کر دئے ہیں جو فطرتی جذبات میں ڈوبے ہوئے اور ان میں بلند خیالی پائی جاتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

طرۂ امیر
امیر احمد علوی

اردو کے باکمال شاعر حضرت امیر مینائی کے حالات اور ان کے کلام کا لاجواب انتخاب جو امیر احمد مرحوم کے ذوق سلیم اور حسن معیاری کا مظہر ہے عمدہ طباعت نفیس کاغذ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

نورانی | امیر حسن

جوئے رواں

افسر صاحب کے کلام کا وہ دلکش اور مقبول مجموعہ جس پر اتر پردیش سرکار نے ان کو پانچ سو روپیہ کا گراں قدر انعام دیا، ان کے کلام میں روانی ہے اور تخئیل میں ندرت انھوں نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ آپ کو وقتی تفریح اور خیالی رنگینیوں کے بجائے زندگی کے حقائق اور روحانی مسرتوں سے روشناس کراتے ہیں ان کے کلام میں پیغام عمل بھی ہے اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی۔ سائیٹ عمدہ طباعت بہترین کاغذ صفحات ۲۰۸ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت دو روپے آٹھ آنے

حامد اللہ افسر

تنقیدی اصول اور نظریے

فن تنقید کے مبادیات پر اردو زبان میں اپنے طرز کی پہلی کتاب جس میں تنقید نگاری کے تاریخی پس منظر سے روشناس کرایا تنقید کے اصول و ضوابط کا تجزیہ کیا ہے اور عام تنقید کے نظریات کی روشنی میں تنقید نگاری کے قواعد متعین کئے ہیں اور اردو ادب کے جادۂ تنقید پر ایک ایسی مشعل روشن کی ہے جس میں تمام شاہراہوں کو روشن کر دیا ہے، اس فن کے معلم اور متعلم دونوں ہی سے اس سے مستفید ہو سکتے ہیں خوشنما طباعت حجم ۲۰۶ صفحات سرورق دلکش، قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اردو شاعری

ادبا ایک عام رہبر یاران نکتہ داں کیلئے

طلبا عام سخنداران نکتہ دان کیلئے

مشہور ادیب و افسانہ نویس

علی عباس حسینی

کے قلم سے

شاعری کی ہر صنف غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، نظم، رباعی، مثلث مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند وغیرہ پر جو اعتراضات مغرب زدگی کے زیر اثر اب تک کئے گئے ہیں اُن سب کے محققانہ جوابات مع امثلہ و انتخابات (زیر طبع)

دوشیزۂ قاف

سنہ ۱۴۳ ہجری میں خان محبوب طرزی۔ جارجیا اور آرمینیا میں مقام حدث کے قریب ڈیڑھ لاکھ عیسائیوں اور بارہ ہزار مسلمانوں میں ایک زبردست خوں آشام معرکۂ جنگ پیش آیا تھا جسکی تاریخی تفصیلات کو طرزی صاحب نے حسن و عشق کے ایک دلکش واقعہ کیساتھ ملاکر اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک آپ پر یکساں محویت طاری رہیگی طباعت دیدہ زیب، مجلد خوبصورت سرورق۔ قیمت پانچ روپے

مجبور

مجبوری اور محبت کا تصادم اگر دو محبت والے دلوں میں پیدا ہو جائے تو اور محبت سے فائدہ کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تفصیل خان محبوب طرزی کے اس سوشل ناول میں ملاحظہ فرمائیے جو مجبور ہوتے ہوئے بھی محبت سے ٹکراؤ پیدا کرکے محبت کو کندن کی طرح ظاہر کر دیتا ہے قیمت چار روپے آٹھ آنے

دلربا

طرزی صاحب کا یہ سوشل ناول طرزی صاحب کا یہ سوشل ناول بے حد سبق آموز ہے خصوصاً اس دور کے اُن نوجوانوں کے لئے جو فلمی زندگی کو دور سے دیکھ کر اور سن کر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور اپنی عزت و آبرو مٹا کر ناکامی و نامرادی سے دوچار ہوتے ہیں۔ زبان اور انداز بیان بہت شگفتہ ہے طباعت و کاغذ عمدہ خوبصورت گردپوش قیمت مجلد تین روپے

جمیلہ

جمیلہ خاں محبوب طرزی کا وہ جیتا جاگتا ناول ہے کہ جس کی کہانی بہتوں کی عیش و مسرت کی زندگی کو ملیا میٹ کر چکی ہے جمیلہ کی زندگی اور اس کی سزا محبت بھرے دلوں میں گدگدی پیدا کر چکی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ محبت کے سانچے میں جمیلہ (الجزائری لڑکی) کو دیکھیں اور اسکی زندگی سے سبق حاصل کریں تو اس کتاب کو ضرور پڑھئے۔ خان محبوب طرزی نے اپنے خصوصی طرز نگارش سے اس ناول میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے

شہید محبت بوٹا سنگھ

خان محبوب طرزی کا محبت سے بھرپور تازہ ترین ناول شہید محبت بوٹا سنگھ جس میں شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور وامق و عذرا والی رنگینی اور طربیہ محبت والی کہانی ایسے انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے کے بعد بے چینی اور بیقراری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ محبت کے متوالے بغیر ختم کئے اس ناول کو چین سے نہیں بیٹھتے قیمت چار روپیہ۔

مجنوں گورکھپوری

پردیسی کے خطوط مجنوں گورکھپوری کے خطوط کا ایک ایسا مجموعہ جو علمی و ادبی حلقوں میں بیحد مقبول ہوئے، ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں نے ان دلچسپ اور مفید خطوط کی بہت تعریف کی ہے ان میں بہت سے اہم علمی ادبی نکات موجود ہیں طرز تحریر میں بڑی دلکشی ہے۔ طباعت کتابت اعلیٰ، مجلد مع خوبصورت گردپوش۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

ڈاکٹر محمد حسن

ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن کے بیش گراں قدر پراز معلومات ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس میں اس قسم کے عنوانات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، جدید اردو شاعری اردو افسانہ۔ غالب کا تصور غم، ادب برائے زندگی، لکھنؤ میں اردو ادب، پریم چند کا دور وغیرہ ۲۷۲ صفحات، خوبصورت گردپوش، مضبوط مجلد، دیدہ زیب طباعت قیمت تین آٹھ آنے۔

ڈاکٹر محمد حسن

پیسہ اور پرچھائیں ڈاکٹر محمد حسن کے ریڈیائی ڈرامے جو ابھی تک "فردوس گوش" تھے اب طبع ہو کر "جنت نگاہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، اس میں وہ ڈرامہ بھی شامل ہے جس پر آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستان گیر مقابلہ میں اول قرار دے کر ان کو پانچ سو روپیہ انعام دیا ہے، پیسہ اور پرچھائیں قوس و قزح کی طرح ہفت رنگ ہے اس میں تاریخی ڈرامے بھی ہیں اور سماجی بھی، آنسو بھی اور قہقہے بھی، یہ ایک نسل کے جذباتی مدوجزر کا آئینہ ہے۔ نو ڈراموں کا مجموعہ، ضخامت ۲۴۸ صفحات اعلیٰ طباعت، بہترین کاغذ مجلد مع خوبصورت سرورق۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

پھولوں کا انبار ———— منظر سلیم

جو رومان اور محبت سے بھرپور ہوتے ہوئے سوشل ناول کہے جانے کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ جو ناول پڑھنے والے ہیں ان کو یہ ناول اچھوتا اور بہت ہی دلچسپ معلوم ہوگا۔ قیمت چار روپے۔

ادب کا مقصد

ہاشمی صاحب کے آٹھ ادبی و تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ نہ صرف بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے بلکہ اس میں اہل ذوق کے لئے دعوت غور و فکر بھی ہے، پہلا مضمون ہے ادب کا مقصد، جو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نظریوں میں توافق اور اعتدال کی طرف رہنمائی کرتا ہے، دوسرے مضمون میں استاد ذوقؔ اور ان کی شاعری پر نقد و تبصرہ ہے۔ مومن پر دو مضمون ہیں اور دونوں میں مومن کی حیات اور ان کی شاعرانہ عظمتوں پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔ ایک مضمون مرزا غالبؔ پر ہے۔ اقبالؔ پر ایک خاص نقطۂ نظر سے ایک مقالہ بڑے غور و فکر سے لکھا ہے۔ واجد علی شاہ اخترؔ تاجدار اودھ کے غیر مطبوعہ خطوط بھی ایک مضمون کی شکل میں پیش کئے ہیں جو معلومات افزا ہیں۔ آخری مضمون علم عروض کے متعلق ہے اور طلبا اور اہل ذوق کے لیے بے حد مفید ہے۔

ہاشمی صاحب کی تحریروں میں سنجیدگی اور اعتدال ہے۔ شدت پسندی اور رجعت پسندی سے وہ بہت دور رہتے ہیں یہ ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اسی لیے آپ کے مضامین طلبا کے لیے خصوصاً بہت نافع ہوتے ہیں اور دیگر اہل ذوق کے لیے اچھے رہنما۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، خوشنما سرورق۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے

فروغ جام (منشور واحدی)

کے نام سے شائع کر رہا ہے امید ہے کہ اہل ذوق حضرات اس کو پسند فرما کر ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ قیمت دو روپے۔

مختصر فہرست
بہ ترتیب حروف تہجی مصنفین

پروفیسر آل احمد سرور

ادب اور نظریہ	ہے/
نئے اور پرانے چراغ مع افسانہ جدیدہ	صہ/
تنقیدی اشارے ،،	سے/
ذوق جنوں	ہے/

پروفیسر احتشام حسین رضوی

ذوق ادب اور شعور	سے/
ساحل اور سمندر	للعہ/
روایت و بغاوت	ہے/
تنقیدی جائزے	سے/
اردو کی کہانی	عہ/
سلک گہر	سے/
ادب پارے نظم و نثر	للعہ/ ۱۲/
تنقیدی نظریات	للعہ/

ڈاکٹر احسن فاروقی

اردو میں تنقید	۲/
بہادراج بلی	عہ/

پروفیسر اختر اورینوی

قدر و نظر	ہے/

افگر مشتاق

اچھی نظمیں	۵/

امیر محمد علوی مرحوم

بہادر شاہ ظفر	سے/
طرۂ امیر	للعہ/
اردو شاعری	للعہ/
یادگار انیس	سے/

امیر حسن نورانی

اللہ کے پیارے	۸/
سیرت ابوبکر صدیق (رض)	۶/
سیرت عمر فاروق رض	۶/
سیرت عثمان غنی رض	۴/
سیرت علی مرتضیٰ رض	۴/
ہندی کے مسلمان شعرا	۱۲/

انصر کریم قدوائی

رخسار سحر — عہ/

انوار الحسن صدیقی

محمد حسین آزاد — ۴/

سرسید احمد خاں — ۴/

مولانا الطاف حسین حالی — ۴/

مولانا شبلی نعمانی — ۴/

ڈپٹی نذیر احمد — ۴/

آوارہ

اپنی موج میں — عہ/

بہزاد لکھنوی

ثنائے حبیب — ۱۲/

جلال لکھنوی

سرمایہ زبان اردو — سے/

حامد اللہ افسر

جوش رواں — عا/

تنقیدی اصول اور نظریے — عا/

گاندھی کے ساتھ — عہ/

ہمارا جھنڈا — عہ/

خان محبوب طرزی

ایک جان تین قالب — للعہ/

قیامت صغریٰ — سے/

دوشیزہ قاف — صہ/

فریدہ — عا/

دلربا — سے/

شہید محبت بوٹا سنگھ — للعہ/

نغمۂ کوہسار — للعہ/

مجبور — للعہ/

جمیلہ — للعہ/

الفت — للعہ/

آغاز سحر — سے/

امین آباد — سے/

نیا راستہ — سے/

یاقوتی — سے/

شجاعت علی

راکھی — ۴/

مطالعہ شبلی — سے/

جواہرات اسمٰعیل — عہ/

میٹھے بول — عہ/

شبیہ الحسن

تنقید و تحلیل — سے/

صادق سردھنوی

اسپین کی شہزادی — للعہ ر

معرکۂ روم و یونان — للعہ ر

صالحہ عابد حسین

قطرے سے گہر ہونے تک — سے ر

صدیقہ بیگم سیوہاروی

ٹھیکرے کی مانگ — عہ

ضیا عظیم آبادی

مداوی یا ڈوبتی نیا — للعہ ر

طاہر دیالپوری

پیام — سے ر

جرجی زیدان

محبوبۂ کربلا — بیہ ر

ظہیر احمد صدیقی

قصائد مومن مع شرح — للعہ ر

مولانا عبدالماجد دریاآبادی

اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں — سے ر

قاضی عبدالستار

شکست کی آواز — سے ر

حکیم عبدالقوی

فلسفۂ اقبال مع انتخاب کلام اقبال — عہ ر

مرزا عسکری لکھنوی

ادبی خطوط غالب — بیہ ر

عبدالشکور

حسرت موہانی — عہ ر

اردو ادب کی جدید تاریخ — (زیر طبع)

تنقیدی سرمایہ حصہ دوم — بیہ ر

علی عباس حسینی

زنٹیوں کا بادشاہ — سے ر

ہمارا گاؤں — سے ر

عادل رشید

لب بام — صہ ر

موسم گل — صہ ر

غلام احمد فرقت

کف گل فروش — سے ر

اردو ادب میں طنز و مزاح — للعہ ر

صید و ہدف — عہ

پروفیسر کلیم الدین

سخنہائے گفتنی — للعہ ر

اردو تنقید پر ایک نظر — للعہ ر

مائل ملیح آبادی

سفر — سے ر

معیار — للعہ

غزنی دروازہ — للعہ

پاگل خانہ — عہ ۱۲

لال قلعہ — سے

فلسفی ابن رشد — صہ

مسیح الحسن رضوی

چوتھی بہن — عہ ۱۲

مجنوں گورکھپوری

نقوش وافکار — سے

ابوالخیر — ۳

پروسی کے خطوط — سے

ڈاکٹر محمد حسن

ادبی تنقید — سے

پیسہ اور پرچھائیں — عہ

منظر سلیم

پھولوں کا ہار — صہ

ناظر کاکوروی

ستاروں سے آگے — سے

مطالعہ حالی — سے

نظم طباطبائی

شرح دیوان غالب — للعہ

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

ایک نادر روزنامچہ — عہ

ادب کیا ہے — عہ

ادب کا مقصد — عہ

نشور واحدی

فروغ جام — عہ

نادم سیتاپوری

وارث ولیم اور اکرام علی — للعہ

وحشی محمود آبادی

زینب ساحرہ — سے

سید سالار مسعود غازی — صے

کلب مصطفےٰ

فن خطابت — صہ